July
2026

ماہنامہ

پیام عرفات

رائے بریلی

اسلام کو ہر مفاد پر ترجیح دیجیے

”علماء اور دانشوروں کا یہ فریضہ ہے کہ اسلام کے مفاد کو ہر جماعت، ہر ادارہ، ہر مدرسہ اور ہر گروہ کے مفاد پر ترجیح دیں، میں آپ سے صاف کہتا ہوں کہ اگر ہمیں معلوم ہو کہ سب جماعتوں کو مٹا دینا پڑے گا، سارے نشانوں کو نکال دینا پڑے گا، سارے ناموں کو ختم کر دینا پڑے گا، سارے بورڈوں کو ہٹا دینا پڑے گا اور اسلام اس ملک میں غالب رہے گا تو ہمیں ایک منٹ بھی اس میں پس وپیش نہیں ہونا چاہیے، ہمیں دین وملت کا مفاد ہر جماعت سے عزیز ہونا چاہیے، سہرا کسی کے سر بندھے سہرا ہونا چاہیے، حضور ﷺ کا معجزہ یہ تھا کہ صحابہ کرامؓ کے دل سے یہ شوق نکل گیا تھا کہ ان کا کارنامہ سمجھا جائے۔“ (دعوتِ فکر وعمل: ۸۶-۸۷)

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ

مرکز الإمام أبی الحسن الندوي
دار عرفات تکیہ کلاں رائے بریلی

اسلامی نظام تعلیم وتربیت کی ضرورت واہمیت

حضرت مولانا سید محمد الحسنی علیہ الرحمۃ

’’بلاشبہ اس سے بڑھ کر خیانت اور سنگین جرم کچھ نہیں ہوسکتا کہ وہ امت مسلمہ جس کے پاس آسمانی پیغام کی امانت اور اقوام عالم کی رہنمائی کا پورا نظام موجود ہے، وہ دنیا کی دیگر اقوام کے سامنے محض تماشائی یا ایک حاشیہ بردار قوم بن کر رہ جائے اور وہ اس خلعتِ خلافت کا جوا اپنی گردن سے اتار پھینکے جو اللہ تبارک وتعالیٰ نے اسے دنیاوی قوموں کی قیادت کرنے اور روئے زمین پر اپنی نیابت کا فریضہ انجام دینے اور انسانی سماج کی رہنمائی کرنے کے لیے عطا فرمایا تھا۔

واقعہ یہ ہے کہ اگر عالم اسلام حقیقی طور پر یہ آہنی عزم کرلے کہ وہ اپنے نفس کی غلامی اور سامراجی نظام کی زنجیروں سے آزادی حاصل کرے گا، کروڑوں بے گناہوں کو ذلت ورسوائی کے عذاب سے نجات دلائے گا، انسانیت کو اس کے دشمنوں کے پنجہ ظلم سے آزاد کرے گا، اس کے آنسو پونچھے گا اور روئے زمین پر پھیلی ہوئی انسانی برادری کا ہاتھ پکڑ کر اسے ایک وسیع اور کشادہ ترافق، ایک پاکیزہ وخوش گوار اور آسودہ حال زندگی اور دنیا وآخرت کی حقیقی کامیابی کی طرف لائے گا تو ظاہر ہے کہ یہ آسان کام نہیں بلکہ اس کے لیے ایک جہد مسلسل، مشقت خیز اور صبر آزما سعی پیہم اور بڑی سطح پر قربانی کی ضرورت ہوگی۔ اس جاں گسل وادی میں غیر معمولی بصیرت اور نہایت دقیقہ رسی بھی ضروری ہوگی لیکن یہی جدوجہد اس کے اصل مقام ومنصب کے لیے موزوں ترین ہے بلکہ اگر دیکھا جائے تو یہی چیز اس کے وجود کا اصل مقصد، اس کی بعثت کا حقیقی ہدف اور وہ بنیادی نکتہ ہے جس پر اسلامی عمارت کی بلند وبالا اور پرشکوہ عمارت تعمیر ہے۔

یہ ایک وسیع کام ہے اور ہمہ گیر بھی، اس کے لیے سب سے پہلے ضرورت ہے کہ عالم اسلام کے عوام اور خصوصاً نوجوانوں کے اندر ایک نئے ایمان، ولولہ انگیز روح اور ایک ایسی جرأت مندانہ وانقلابی اور فکر وشعور کو جلا بخشنے والی اسلامی فکر کی روح پھونک دی جائے جو انہیں زندگی کے ہر میدان میں غیر معمولی متحرک اور سرگرم عمل بنادے اور ان کے دلوں سے احساس کمتری کے اس ناسور کو کھرچ کر نکال دیا جائے جس نے انہیں دیمک کی طرح کھوکھلا کردیا ہے، مسلم نوجوانوں میں احساس کمتری کی ایک کھلی وجہ عیسائی مشنریز کی حد سے زیادہ فعالیت اور وہ سامراجی یلغار ہے جس نے ان کے ذہن ودماغ کو پوری طرح معطل کردیا ہے پھر سب سے بڑھ کر وہ نظام تعلیم وتربیت بھی اس کا ذمہ دار ہے جس کا بنیادی خاکہ مغربی طرز فکر کے سانچوں سے ڈھل کر ہی نکلتا ہے۔

موجودہ حالات میں سب سے بڑھ کر ضرورت اس بات کی ہے کہ ایک ایسا آزاد تعلیمی نظام قائم کیا جائے جو اسلام کے تقاضوں سے پوری طرح ہم آہنگ ہو، وہ اس کی ان سرمدی اور لازوال حقیقتوں پر پورا اترتا ہو جو نہ شب وروز کے تغیرات سے بدلتی ہیں اور نہ حوادثِ زمانہ سے متاثر ہوتی ہیں اور اسی کے ساتھ وسائل کی حد تک ہر نئی اور مفید چیز کو پوری فراخ دلی سے قبول کیا جائے، اس لیے کہ حکمت مؤمن کی گم شدہ میراث ہے جہاں بھی اسے ملے تو وہی اس کا زیادہ حق دار ہے۔

سچی بات یہ ہے کہ اگر ایسا نظام برپا ہوجائے تو پھر دنیا کی آنکھیں جلد ہی ایک ایسی نسل نو کا مشاہدہ کریں گی جو اپنی روح کے اعتبار سے تازہ دم ہوگی، اپنے فکر وشعور کے اعتبار سے نئی ہوگی اور اپنے ایمان ویقین کے اعتبار سے فولادی صلابت کی حامل ہوگی۔ حقیقت یہ ہے کہ آج کا انسانی معاشرہ بیش قیمت نئی اور نادر چیزوں سے مالا مال ہے لیکن وہ اس بنیادی نعمت سے محروم ہے جس کی اس کو سب سے زیادہ ضرورت ہے۔‘‘

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اردو اور ہندی میں شائع ہونے والا

ماہنامہ

پیام عرفات

رائے بریلی

مرکز الامام أبی الحسن الندوی دارعرفات تکیہ کلاں رائے بریلی (یوپی)

جلد: ۱۸ | جولائی ۲۰۲۶ء-محرم الحرام ۱۴۴۸ھ | شمارہ: ۷

تین پسندیدہ باتیں

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ:

”إِنَّ اللّٰهَ يَرْضَى لَكُمْ ثَلَاثاً أَنْ تَعْبُدُوْهُ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهِ شَيْئاً وَأَنْ تَعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعاً وَلَا تَفَرَّقُوْا.“

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

(بلاشبہ اللہ تمہارے لیے تین چیزوں کو پسند کرتا ہے؛ تم اسی کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ، اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑ لو اور آپس میں منتشر نہ ہو جاؤ۔)

(صحیح مسلم: ٤٥٧٨)

مجلس ادارت

بلال عبدالحی حسنی ندوی

مفتی راشد حسین ندوی

عبدالسبحان ناخدا ندوی

محمد حسن ندوی

معاون ادارت

محمد مکی حسنی ندوی

محمد امین حسنی ندوی

محمد ارمغان بدایونی ندوی

پرنٹر پبلشر محمد حسن ندوی نے ایس، اے، آفسٹ پرنٹرس، مسجد کے پیچھے، پھاٹک عبداللہ خاں، سبزی منڈی، اسٹیشن روڈ، رائے بریلی سے طبع کرا کر دفتر ”پیام عرفات“ مرکز الامام أبی الحسن الندوي، دارِعرفات، تکیہ کلاں رائے بریلی سے شائع کیا۔

www.abulhasanalinadwi.org

فی شمارہ: -/Rs.15 | E-Mail: markazulimam@gmail.com | سالانہ زرتعاون: -/Rs.150

Markazul Imam Abil Hasan Al-Nadwi Samiti (Punjab National Bank) A/c No. 6127002100000339 (IFSC: PUNB0612700)

فہرس

ایک ہو جائیں تو بن سکتے ہیں خورشید مبیں (اداریہ).....۳

.....بلال عبدالحی حسنی ندوی

تقویٰ کیا ہے؟.....۴

.....بلال عبدالحی حسنی ندوی

عدت اور سوگ کے متفرق احکام.....۶

.....مفتی راشد حسین ندوی

مولانا ابوالکلام آزاد اور ندوۃ العلماء.....۸

.....ڈاکٹر عبید الرحمٰن ندوی

احتجاج اور صحیح طریقہ عمل.....۱۰

.....محمد مکی حسنی ندوی

الحاد کا طوفان، اسباب اور علاج.....۱۲

.....محمد نجم الدین ندوی

صحابہ کرامؓ کی محبت و جاں نثاری کے چند نمونے.....۱۴

.....محمد امین حسنی ندوی

قیام ندوۃ العلماء اور چند اہم شخصیات.....۱۶

.....ابوالحسن علی حسنی ندوی

ہم نے سبق لیا ہے حیاتِ رسولؐ سے.....۱۹

.....محمد ارمغان بدایونی ندوی

.....کوئی آیا نہ مگر رحمت عالم بن کر

حضرت جگر مرادآبادیؒ

ہر زمانے میں پیمبر بھی نبی بھی آئے
مصلح ملی وملکی بھی رشی بھی آئے
حق کے جوینده بھی حق کے ولی بھی آئے
واقف محرم اسرار خفی بھی آئے
آئے دنیا میں بہت پاک مکرم بن کر
کوئی آیا نہ مگر رحمت عالم بن کر

کس نے جام مئے توحید پلایا سب کو
کس نے پیغام مساوات سنایا سب کو
راستہ کس نے حقیقت کا دکھایا سب کو
کس نے اس حسن کا دیوانہ بنایا سب کو
تم نے دیکھا ہے بہت دفتر پیغام اس کا
اور ایسا کوئی گزرا ہو تو لو نام اس کا

کوئی صدیقؓ سا گزرا ہو تو للہ دکھاؤ
تم نے فاروقؓ سا دیکھا ہو تو للہ دکھاؤ
کوئی عثمانؓ سا آیا ہو تو للہ دکھاؤ
کوئی حیدرؓ سا جو پایا ہو تو للہ دکھاؤ
ثانی احمد ذی شان تو کیا لاؤگے
اس کی امت کی مثالیں بھی نہیں پاؤگے

ایک ہو جائیں تو بن سکتے ہیں خورشید مبیں

بلال عبدالحی حسنی ندوی

ملکی سطح پر دیکھئے یا عالمی سطح پر اس وقت مسلمانوں کے حالات ایسے ہیں کہ بے ساختہ یہ شعر زبان پر آتا ہے ؎

اے خاصہ خاصان رسل! وقت دعا ہے　　امت پہ تیری آ کے عجب وقت پڑا ہے

اغیار کی کرم فرمائیاں اپنی جگہ اس کے ساتھ اپنوں کی بھی نادانیاں اپنی جگہ ع　　سادگی مسلم کی دیکھ اوروں کی عیاری بھی دیکھ

ایک طرف "الکفر ملة واحدة" کی حقیقت آشکارا ہے تو دوسری طرف ہم اپنے مسائل حل کرنے کے بجائے ان کو بڑھانے میں مصروف ہیں، اسوۂ رسول ﷺ جو ہر زمانہ میں ہر مسئلہ کا حل ہے، اس کو اپنانے کے بجائے طرح طرح کے حل پیش کیے جا رہے ہیں، کاش کہ یہ امت ''امت واحدہ'' ہوتی، اختلافات کا ہونا ایک طبعی چیز ہے مگر ان کو اس حد تک آگے بڑھا دینا کہ حدود قائم نہ رہیں اور یہ خیال بھی نہ رہے کہ نتیجہ کیا ہونے والا ہے، امت کو اس کا کیا خمیازہ بھگتنا پڑے گا، اغیار اس کا کیا فائدہ اٹھائیں گے اور بات کہاں تک پہنچ جائے گی، یہ انتہائی نادانی کی بات ہے، پوری امت مسلمہ جن حالات سے دوچار ہے، اس کا تقاضا کیا ہے؟ ضرورت تو اس بات کی تھی کہ ہر قیمت پر انتشار سے بچا جائے اور اتحاد قائم رکھنے کے لیے اگر اپنی رائے دبانی پڑے اور ذاتی کچھ نقصان بھی اٹھانا پڑے تو اتحاد کے آگے اس کی کوئی بڑی قیمت نہیں تھی، کم سے کم درجہ یہ تھا کہ اپنے اپنے طور پر افراد بھی اور جماعتیں بھی خدمت دین میں مصروف رہیں، اگر کسی دوسری جماعت یا افراد سے کسی بات میں اتفاق نہ ہو تو بھی بجائے اس میں الجھنے کے مثبت طریقہ پر کام کیا جاتا رہے، اللہ تعالیٰ راستے کھولنے والا ہے۔

عالمی سطح پر اور ملکی سطح پر دیکھا جائے تو کام ہی کتنا ہو رہا ہے، اس میں بھی اگر جگہ جگہ رخنے پیدا کیے جائیں گے تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا، ہر طرف صلاحیتوں کا ضیاع ہوگا اور امت کا شیرازہ اور بکھرتا چلا جائے گا۔

افسوس کی بات یہ ہے کہ دین کے نام پر اہل دین کو بانٹا جا رہا ہے، کوئی رائے قائم کر لی جاتی ہے خواہ رائے قائم کرنے والا کوئی فرد ہو یا کوئی جماعت ہو یا افراد ہوں، اس رائے کو منزل من اللہ سمجھ لیا جاتا ہے اور پھر اس پر اتنا اصرار ہوتا ہے کہ نہ پھر امت کے انتشار کا خیال رہ جاتا ہے اور نہ شماتت اعداء کا۔

اس وقت ساری دنیا مسلمانوں کے پیچھے لگی ہے، مسلمانوں کی انتہائی بھیانک تصویر دنیا کے سامنے پیش کی جا رہی ہے، اس کے لیے میڈیا کا بے دریغ استعمال کیا جا رہا ہے اور اس کے لیے پوری دنیا ایک ہے، دوسری طرف ہم مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ ہم ان کی مدد کرنے میں لگے ہیں اور بجائے اس کے کہ ہم اپنی صحیح اخلاقی تصویر دنیا کے سامنے پیش کرتے' آپس میں ہم خود دست بہ گریباں ہیں، یہ حالات انتہائی تشویش ناک ہیں، ضرورت اس بات کی ہے عقائد و اصول میں پورے تصلب کے ساتھ جزوی اور فروعی مسائل میں قدرے توسع اختیار کیا جائے اور امت کے شیرازہ کو انتشار سے بچانے کے لیے معمولی باتوں کو نظر انداز کیا جائے، ورنہ خطرہ اس بات کا ہے کہ جو اسپین میں ہو چکا اور مسلمانوں کو آپس میں لڑا کر جس طرح اسلام کو وہاں سے اکھاڑ دیا گیا' تاریخ پھر دہرائی جائے، اس کا پورا نقشہ تیار ہے، اگر ہم ہوشیار نہ ہوئے اور ہم نے ایک ہو کر مضبوط ایمان کے تحفظ کی فکر نہ کی تو آگے آنے والے حالات سخت سے سخت تر ہو سکتے ہیں۔ أعاذنا الله منها!

تقویٰ کیا ہے؟

بلال عبدالحی حسنی ندوی

شک وشبہ سے احتیاط کی تعلیم:

عَنِ الْحَسِنِ بْنِ عَلِيٍّ -عَلَيْهِ وَعَلىٰ جَدِّهِ وَأَبِيْهِ السَّلَامُ- قَالَ: حَفِظْتُ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: دَعْ مَا يَرِيْبُكَ إِلىٰ مَا لَا يَرِيْبُكَ. (سنن الترمذی، أبواب صفة القيامة، باب اعقلها وتوكل: ٢٥١٨)

(حضرت حسن بن علی -علیہ وعلیٰ جدہ وابیہ السلام- سے منقول ہے، فرماتے ہیں: میں نے یہ بات اللہ کے رسول ﷺ سے محفوظ کی کہ ہر وہ چیز چھوڑ دو جو تمہیں شبہ میں ڈالتی ہے اور اس چیز کو اختیار کرو جو بغیر شبہ کی ہے۔)

یہ روایت حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما سے منقول ہے، اس میں ایک خاص اصطلاح استعمال ہوئی ہے:

"عَلَيْهِ وَعَلىٰ جَدِّهِ وَأَبِيْهِ السَّلَامُ"

یہ ایک اصطلاح ہے، انبیاء کے لیے "علیہم السلام" کا لفظ استعمال ہوتا ہے، معنوی اعتبار سے دیکھا جائے تو اس میں بظاہر کوئی حرج نہیں ہونا چاہیے، "علیہم السلام" کا استعمال کسی کے لیے بھی کیا جاسکتا ہے، اگر دیکھا جائے تو لغوی اعتبار سے اس کے معنی سلامتی کے ہیں لیکن یہ ایک اصطلاح بن گئی ہے اور انبیاء علیہم السلام کے لیے خاص ہے، اگر کسی اور کے لیے اس کا استعمال کیا بھی جاسکتا ہے تو تبعاً کیا جاسکتا ہے جیسا کہ اس روایت میں ہے۔

حضرت حسنؓ کے نانا حضور اقدس ﷺ ہیں، اس مناسبت سے علیہ السلام کا استعمال ہوا ہے، صحابہ کے لیے "رضی اللہ عنہم" کا استعمال ہوتا ہے، یہ بھی ایک طرح کی اصطلاح ہے، اس کا پاس ولحاظ رکھا جائے، اسی طرح دوسرے حضرات کے لیے "رحمہ اللہ" یا "رحمۃ اللہ علیہ" جیسے الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔

اس ترتیب کو ملحوظ رکھنا بہتر ہے، اس لیے کہ یہ ایک طرح کی اصطلاح بن گئی ہے اور اس میں اشتباہ ہوسکتا ہے، اگر کسی کے لیے علیہ السلام کا استعمال ہوگا تو شبہ ہوگا کہ وہ نبی ہے اور کسی کے لیے رضی اللہ عنہم کا استعمال ہوگا تو شبہ ہوگا کہ وہ صحابی ہے۔ بہتر یہ ہے کہ اس میں اس ترتیب کو ملحوظ رکھا جائے۔

آپ ﷺ کی وفات کے وقت حضرت حسنؓ کی عمر ایسی تھی کہ وہ تحمل روایت کی عمر ہوتی ہے، حضرات محدثین چار پانچ سال کی عمر کو تحمل روایت کی عمر قرار دیتے ہیں کہ اس عمر میں اگر کسی نے آپ ﷺ سے کوئی بات سنی ہے تو وہ نقل کرسکتا ہے، اس کی بات صحیح مانی جائے گی اور قابل اعتماد ہوگی۔ حضرت حسنؓ کی عمر گرچہ زیادہ نہیں تھی لیکن اتنی تھی کہ وہ تحمل روایت کی عمر ہوتی ہے، اسی لیے انھوں نے یہ صیغہ استعمال کیا کہ

"حَفِظْتُ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ"

(میں نے اللہ کے رسول ﷺ سے ایک چیز محفوظ کی۔)

یعنی جو بات وہ آگے فرمارہے ہیں اس کے متعلق وضاحت ہے کہ یہ بات میں نے محفوظ کی، یہ لفظ اسی لیے استعمال کیا کہ وہ چھوٹے تھے، ہوسکتا ہے کوئی سوچے کہ وہ چھوٹے تھے، ان کو کیا یاد ہوگا، اپنی طرف سے تو نہیں کہہ رہے تو اس سے وضاحت بھی ہورہی ہے کہ میں نے اللہ کے رسول ﷺ سے اس کو محفوظ کیا ہے یعنی گویا یہ بات میں یاد سے کہہ رہا ہوں اور ان کی عمر تحمل روایت کی ہے، اس لیے جو بات وہ فرمارہے ہیں وہ اپنی جگہ بالکل صحیح ہے، قابل اعتماد ہے، انھوں نے جو بات ارشاد فرمائی، وہ اللہ کے رسول ﷺ نے حضرت حسنؓ سے براہ راست کہی یا یہ کہ آپ ﷺ فرمارہے تھے اور وہ سن رہے تھے کہ

"دَعْ مَا يَرِيْبُكَ إِلىٰ مَا لَا يَرِيْبُكَ"

ایک دوسری جگہ اسی روایت میں ان الفاظ کا اضافہ بھی ہے کہ

"فَإِنَّ الصِّدْقَ طُمَأْنِينَةٌ وَالْكَذِبَ رِيبَةٌ"

اس روایت میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ جو چیز تمہیں کھٹکے اس کو چھوڑ کر وہ چیز اختیار کرو جس میں کسی قسم کی کوئی کھٹک نہ ہو، کسی قسم کی کوئی خلش نہ ہو، اختیار کرتے وقت تمہیں پورا اطمینان اور بھروسہ ہو کہ جو بات میں کہہ رہا ہوں وہ بالکل صحیح ہے اور اس میں کوئی شبہ نہیں ہے، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ

"دَعْ مَا يَرِيبُكَ إِلَىٰ مَا لَا يَرِيبُكَ" (ہر وہ چیز چھوڑ دو جو تمہیں شبہ میں ڈالتی ہے اور اس چیز کو اختیار کرو جو بغیر شبہ کی ہے۔)

یعنی ہر وہ چیز اختیار کرو جس میں کسی قسم کا کوئی کھٹکا نہیں پھر فرمایا:

"فَإِنَّ الصِّدْقَ طُمَأْنِينَةٌ وَالْكَذِبَ رِيبَةٌ" (بلاشبہ سچائی اطمینان ہے اور جھوٹ آدمی کو خلجان میں ڈالتا ہے۔)

جھوٹ آدمی کو خلجان، شک وشبہ اور پریشانی میں مبتلا کرتا ہے، بعض مرتبہ آدمی جھوٹ بات کہہ دیتا ہے، یہ سوچ کر کہ ہمیں کچھ فائدہ ہو جائے گا لیکن بعد میں اس کو یہ احساس ہوتا ہے کہ ہم نے یہ کیا کیا؟ کبھی صراحت کے ساتھ جھوٹ نہیں ہوتا، وہ اس میں تاویل کرتا ہے لیکن اس کے باوجود اس کے اندر کھٹک پیدا ہوتی ہے کہ میں نے جو بات کہی وہ مجھے نہیں کہنی چاہیے تھی۔

سچائی کے ساتھ، دل کے پورے اطمینان وسکون کے ساتھ، بغیر کسی کھٹک اور بغیر کسی شبہ کے آدمی جو بات کہتا ہے وہ بات مقبول عنداللہ بھی ہوتی ہے اور مقبول عندالناس بھی ہوتی ہے، ایسی بات کو تلقی بالقبول حاصل ہو جاتی ہے، لوگ اس کو مانتے ہیں اور جو بات آدمی اس طرح کہتا ہے کہ خود اس کو کھٹک ہوتی ہے کہ میں صحیح کہہ رہا ہوں یا غلط کہہ رہا ہوں؟ تو ایسی بات نہ تو اللہ کے یہاں مقبول ہوتی ہے اور نہ عندالناس مقبول ہوتی ہے۔

آپ ﷺ نے یہاں جو بات فرمائی یہ تقویٰ کا ایک حصہ ہے اور اسی لیے مصنف کتاب نے اس روایت کو تقویٰ کے باب میں نقل کیا ہے کہ اگر تقویٰ کی زندگی اور تقویٰ کا مزاج ہوتا ہے پھر آدمی جو کہتا ہے سوچ کر کہتا ہے، جو کرتا ہے سوچ کر کرتا ہے، کیفیات پیدا ہوتی ہیں تو اس میں بھی وہ حدود قائم رکھتا ہے اور اگر تقویٰ کا مزاج نہیں ہوتا تو نہ کہتے ہوئے سوچتا ہے، نہ کرتے ہوئے سوچتا ہے اور نہ کیفیات کے اندر حدود قائم رکھ پاتا ہے۔

تقویٰ کی جامعیت میں تینوں چیزیں شامل ہیں، آدمی جو بات کہہ رہا ہے تقویٰ وہ بات بھی چاہتی ہے، آدمی جو عمل کر رہا ہے تقویٰ وہ عمل بھی چاہتا ہے، آدمی کے اندر جو کیفیات پیدا ہوتی ہیں تقویٰ وہ کیفیات بھی چاہتا ہے۔ اگر آدمی کے اندر تقویٰ کا مزاج نہیں ہے تو جو سمجھ میں آئے گا وہ کہہ دے گا، جو مزاج میں آئے گا وہ اپنی زبان سے نکال دے گا اور اس کو جو رائے قائم کرنی ہوگی وہ رائے قائم کر لے گا، پھر وہ یہ نہیں سوچے گا کہ ہم جو بات کہہ رہے ہیں وہ کس حد تک صحیح ہے اور کس حد تک مشتبہ ہے اور اس میں کتنے جھول ہیں؟ تقویٰ ایسی چیز ہے کہ اس کا تعلق زبان سے بھی ہے اور اس کا تعلق عمل سے بھی ہے، آدمی جو عمل کرے تو کرنے سے پہلے سوچے کہ میں کیا کرنے جا رہا ہوں؟ میرا عمل صحیح ہے یا غلط؟ اللہ کو راضی کرنے والا عمل ہے یا ناراض کرنے والا؟ اس کی بڑی تفصیلات اوپر گذر چکی ہیں کہ آدمی اگر ذرا سی بھی بے احتیاطی کرتا ہے تو پھسل جاتا ہے، اس کے قدم آگے بڑھ جاتے ہیں اور زبان تو بڑی خطرناک چیز ہے، ایسی خطرناک چیز کہ درانتی کی طرح چلتی ہے، نہ جانے کیا کیا کاٹتی ہے اور اس سے کیا کیا نقصانات ہوتے ہیں؟ زبان کی حفاظت اولین چیزوں میں سے ہے، اس کی بہت زیادہ تاکید ہے اور یہ تقویٰ کی بنیادوں میں سے ہے۔ اگر آدمی زبان کی حفاظت نہیں کر پا رہا ہے تو تقویٰ کا مزاج اپنا نہیں بنا سکتا اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ کہیں کھائی میں گر سکتا ہے اور دوسروں کو کھائی میں گرا سکتا ہے۔ آدمی زبان سے جو بات کہے تو خوب سوچے اور غور کر لے، غور کرنے کے بعد ہی بولے، ایسا نہ ہو کہ کہنے کے بعد غور کرنا پڑے پھر اس کو ندامت اٹھانی پڑے۔

عدت اور سوگ کے متفرق احکام

مفتی راشد حسین ندوی

معتدہ کا بطور علاج سرمہ لگانا:

اگر معتدہ کی آنکھ میں تکلیف ہوتو بطور علاج سرمہ لگاسکتی ہے، البتہ اگر کسی دوسری دوا سے تکلیف دور ہوسکتی ہوتو سرمہ کے بجائے دوا ہی ڈال لینی چاہیے، اس لیے کہ حدیث شریف میں اصلاً معتدہ کو سرمہ لگانے سے منع کیا گیا ہے:

"عن أم سلمة رضي اللّٰه عنها قالت: جاء ت امرأة إلىٰ النبي صلى اللّٰه عليه وسلم فقالت: يا رسول اللّٰه! إن ابنتى توفي عنها زوجها وقد اشتكت عينها."

(صحيح مسلم، كتاب الطلاق، باب وجوب الإحداد فى عدة الوفاة: ١٤٨٩، البخارى، كتاب الطب، باب الإثمد والكحل: ٥٧٠٦ نیز دیکھئے: شامی: ٣/ ٥٣١)

معتدہ کا علاج کے لیے باہر نکلنا:

اگر معتدہ کو کوئی بیماری ہوجائے اور اس کا اسپتال میں لے جاکر علاج کرانا یا بیماری سنگین ہونے کی صورت میں ایڈمٹ کرانا ضروری ہوتو شرعاً اس کی گنجائش ہوگی، اس لیے کہ فقہاء نے ضرورتاً نکلنے کی اجازت دی ہے اور بلاشبہ یہ بھی ایک ضرورت ہے۔ (شامی: ٣/ ٥٣٦)

کسی عزیز کی عیادت کرنے کے لیے یا اس کی وفات پر جانا:

اصل یہی ہے کہ معتدہ شدید ضرورت کے بغیر گھر سے باہر نہ نکلے لیکن فقہاء نے علاج معالجہ کی ضرورت سے نکلنے کی اجازت دی ہے، تعزیت یا عیادت کے لیے نکلنے کی اجازت نہیں دی ہے لیکن اگر کسی قریبی عزیز جیسے باپ ماں بھائی بہن وغیرہ کی وفات ہوجائے، یا ان جیسا کوئی عزیز سخت بیمار ہو اور معتدہ بیمار کو دیکھنے یا میت کو دیکھنے کے لیے سخت بے چینی محسوس کررہی ہوتو اگر اس کا گھر مسافت سفر پر نہ ہوتو علاج معالجہ کے لیے نکلنے پر تلاش معاش پر قیاس کرتے ہوئے یہ اجازت دی جاسکتی ہے کہ دن کو جاکر دیکھ آئے اور رات گھر میں گزارے۔

(شامی: ٣/ ٥٣٦، الفتاویٰ الولوالجیۃ: ٢/ ٨٦)

حالت عدت میں پردہ:

بہت سے لوگ عدت کے دوران پردے کے بارے میں بڑی شدت اختیار کرتے ہیں اور اس شدت کو شرعی حکم سمجھتے ہیں لیکن اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ عدت کے دوران پردہ کا کوئی خصوصی حکم نہیں ہے، نامحرموں کے سامنے ہر حال میں پردے کا حکم ہے اور محارم سے کسی بھی صورت میں پردے کا حکم نہیں ہے، بیٹا، باپ، بھائی، بھتیجہ، جیٹھ، خالہ زاد، چچازاد اور پھوپھی اور ماموں زاد اس کے نامحرم ہیں۔ ان نامحرموں سے عدت کے دوران بھی پردہ کرنا چاہیے اور عدت کے زمانہ کے علاوہ بھی پردہ کرنا چاہیے، البتہ اگر ان کی گھر میں کثرت سے آمد ورفت ہو، ان سے فتنہ کا کوئی اندیشہ نہ ہوتو تنہائی اختیار کیے بغیر چہرہ اور ہتھیلی ان کے سامنے کھول سکتی ہے، بقیہ بدن بال سمیت ڈھانپ کر رکھے۔ (شامی: ١/ ٤٠٥-٤٠٦)

پردے کی یہ ہدایت خود قرآن مجید میں کی گئی ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُل لِّأَزْوَاجِكَ وَبَنَاتِكَ وَنِسَاءِ الْمُؤْمِنِينَ.....الخ﴾ (الأحزاب: ٥٩) (اے نبی! اپنی بیویوں اور اپنی بیٹیوں سے اور مسلمانوں کی بیویوں سے کہہ دیجیے کہ وہ اپنی اوڑھنیاں اپنے اوپر لٹکا لیا کریں۔ الخ)

نیز اللہ کا ارشاد ہے: ﴿قُل لِّلْمُؤْمِنَاتِ يَغْضُضْنَ مِنْ أَبْصَارِهِنَّ.....الخ﴾ (النور: ٣١) (اور ایمان والیوں سے کہہ دیجیے کہ وہ بھی اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنے ستر کی حفاظت کریں اور اپنا سنگار ظاہر نہ کریں سوائے اس کے جو ظاہر ہو ہی جائے مثلاً: ہتھیلی اور چہرہ اور اپنے سینوں پر اپنی اوڑھنیاں ڈال لیں اور اپنا سنگار کسی پر ظاہر نہ ہونے دیں سوائے اپنے شوہروں کے یا اپنے باپ کے یا شوہروں کے باپ کے یا اپنے بیٹوں کے یا اپنے شوہروں کے بیٹوں کے یا اپنے بھائیوں کے یا بھتیجوں کے یا بھانجوں کے۔ الخ)

عدت کہاں گزارے؟

ایک طویل حدیث میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے معتدہ وفات کو پہلے دشواری ہونے پر اس کی اجازت دی کہ شوہر کے گھر کے علاوہ میں عدت گزارے پھر فرمایا:

"امکثی فی بیتك حتی یبلغ الکتاب أجله" (اپنے گھر میں ٹھہری رہو یہاں تک کہ عدت کی مدت پوری ہوجائے۔)

(أبو داؤد، کتاب الطلاق، باب فی المتوفیٰ عنها تنتقل: ۲۲۰۰، الترمذی، أبواب الطلاق واللعان، باب أین تعتد المتوفی عنها زوجها: ۱۲۰٤، مؤطا، کتاب الطلاق)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ حضرت فاطمہ بنت قیس جن کو طلاق دی گئی تھی ایک ویران جگہ تھیں تو ان پر خوف محسوس کیا گیا، اسی لیے آنحضرت ﷺ نے ان کو شوہر کے گھر سے منتقل ہونے کی اجازت دے دی:

"إن فاطمة کانت فی مکان وحش." (البخاری، کتاب الطلاق، باب قصة فاطمة بنت قیس: ۵۳۲۵)

انھی احادیث کی بنیاد پر فقہاء نے لکھا ہے کہ عورت خواہ طلاق کی عدت میں ہو یا وفات کی عدت میں، اصل یہی ہے کہ جس مکان میں شوہر کے ساتھ رہتی تھی، عدت وہیں گزارے اور شوہر کی وفات کے وقت یا طلاق دیتے وقت اگر کہیں اور ہو تو اس کو چاہیے کہ شوہر کے گھر لوٹ آئے اور وہیں عدت گزارے، البتہ کچھ صورتوں میں فقہاء نے شوہر کے گھر کو چھوڑ کر دوسری جگہ عدت گزارنے کی اجازت دی ہے:

۱-شوہر نے طلاق بائن یا مغلظہ دی ہو اور وہ فاسق ہو، اس سے خطرہ ہو کہ گناہ کر بیٹھے گا۔

۲-شوہر یا کوئی ظالم اس کو اس گھر سے نکال دے۔

۳-شوہر کا گھر گر جائے یا اس کے گر جانے کا اندیشہ ہو۔

۴-وہاں اپنے مال کے ضائع ہونے کا اندیشہ ہو۔

۵-گھر کرایہ کا ہو اور شوہر کی وفات کے بعد وہ کرایہ ادا نہ کرسکتی ہو۔

۶-وہ وہاں تنہائی کی وجہ سے ڈرتی ہو۔

اس طرح کے اعذار پیش آنے پر وہ وہاں سے نکل سکتی ہے اور وہاں سے قریب جگہ جا کر عدت گزار سکتی ہے۔

(شامی:۳/۶۳۶م ہندیہ:۱/۵۳۵)

جب عدت شروع ہوتے وقت سفر میں ہو؟

اگر کوئی عورت سفر کر رہی ہو اسی دوران اس کا شوہر اس کو طلاق دے دے، یا اس کا انتقال ہوجائے تو اگر اس کا گھر اس جگہ سے مسافت سفر (۷۸/کلومیٹر یا ۸۳/کلومیٹر) سے کم ہو تو حکم یہ ہے کہ گھر واپس آجائے اور اگر گھر مسافت سفر سے زیادہ دوری پر ہو اور منزل (جہاں جانا ہے) مسافت سفر سے کم دوری پر ہو، یا دونوں مسافت سفر پر ہوں اور وہ وہاں پر آسانی سے عدت گذار سکتی ہو تو منزل پر چلی جائے اور وہیں عدت گزارے، ظاہر ہے عام حالات میں ایسا کرنا مشکل ہوگا، لہٰذا بہتر یہی ہوگا کہ شوہر کے گھر لوٹ آئے اور وہیں عدت گزارے۔ (شامی:۳/۵۳۸)

تب بھی یہی تفصیلات ہوں گی یعنی حج کے لیے ایئرپورٹ جا رہی تھی، اسی دوران طلاق دی گئی، یا شوہر کی وفات کی ہوگئی تو اگر ابھی ایئرپورٹ یا اس کے راستے پر تھا تو اسے حج کا سفر ملتوی کردینا چاہیے اور گھر جا کر عدت گذارنی چاہیے اور اگر ایئرپورٹ مسافت سفر پر یا اس سے زیادہ دوری پر ہے تو ظاہر ہے ساتھ میں کوئی محرم بھی ہوگا تو حج کے لیے جاسکتی ہے، لیکن بہتر یہی ہے کہ گھر لوٹ آئے اور گھر میں عدت گذارے (اگر محرم ساتھ نہ ہو تو لوٹنا لازم ہوگا مثلاً: شوہر ہی کے ساتھ جا رہی تھی اور اس کا انتقال ہوگیا) اور اگر ایئرپورٹ سے روانہ ہونے یا حجاز پہنچنے کے بعد عدت واجب ہوئی تو ظاہر ہے عام حالات میں وہاں رہ کر عدت گزارنا ناممکن ہوگا لہٰذا حج کے مناسک پورے کرلے، بس یہ کرے کہ قیام گاہ سے بلاضرورت باہر نہ نکلا کرے، نہ زیورات پہنے پھر بقیہ عدت واپس آکر گذار لے لیکن اگر کسی کے لیے وہاں عدت گزارنے کا مناسب انتظام ہے تو وہیں عدت گذار کر واپسی کرے۔ (شامی:۳/۵۳۸-۵۳۹)

مولانا ابوالکلام آزاد اور ندوۃ العلماء

ڈاکٹر عبید الرحمٰن ندوی

امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد ان تاریخی شخصیات میں سے ہیں جن کا نام ملک، قوم، سیاست اور صحافت کی دنیا میں آج بھی ایک روشن مینار کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ بیک وقت مفسر قرآن، بہترین خطیب، انشا پرداز، باکمال سیاست داں اور بصیرت افروز صحافی تھے، جنہوں نے اپنی تحریروں کے ذریعے قوم کی فکری رہنمائی اور ذہنی بیداری کا فریضہ انجام دیا۔ ان کی صحافت صرف خبروں کی ترسیل یا حالات کی عکاسی تک محدود نہیں تھی بلکہ ان کی تحریریں ہمہ گیر اور فکری ہوا کرتی تھیں جن کا مقصد غلامی کی زنجیروں کو توڑ کر آزادی کی شمع روشن کرنا تھا۔

مولانا آزاد کی صحافتی زندگی کا آغاز ایسے دور میں ہوا جب برصغیر ہند سیاسی غلامی، فکری جمود اور سماجی انتشار کا شکار تھا۔ اس ماحول میں انہوں نے الہلال اور بعد ازاں البلاغ جیسے جرائد جاری کیے جنہوں نے نہ صرف اردو صحافت کو ایک نیا اسلوب عطا کیا بلکہ مسلمانوں میں سیاسی شعور، دینی حمیت اور قومی یکجہتی کے جذبات کو بھی فروغ دیا۔

مولانا نے اپنے قلم کو انگریزوں کے استبداد کے خلاف ڈھال بنایا جس کی پاداش میں انہیں قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کرنی پڑیں لیکن وہ برابر ہندوستان کی آزادی کے لیے جدوجہد کرتے رہے اور اپنی تحریروں کے ذریعہ لوگوں کو بیدار کرتے رہے۔ مولانا ایک نڈر اور جری صحافی تھے جو حق کو حق اور باطل کو باطل لکھتے تھے اور ظالم کے خلاف ان کا قلم تیغ آب دار ہوا کرتا تھا۔ بقول مفکر اسلام سید ابوالحسن علی ندوی کہ ”وہ (مولانا ابوالکلام آزاد) ایسے مقالات تحریر کرتے جو آگ کے قلم سے تحریر ہوتے تھے۔“ (المسلمون فی الہند: ۱۸۱)

دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کو جن مختلف خصوصیات کی بنا پر دیگر اسلامی اداروں کے درمیان نمایاں مقام و مرتبہ حاصل ہے ان ہی چند خصوصیات میں ایک اہم خصوصیت دار العلوم کی بے لوث اور قابل قدر صحافتی خدمات ہیں۔

مولانا آزاد خداداد صلاحیتوں کے مالک تھے، وہ ایک پیدائشی صحافی تھے لیکن سچ یہ ہے کہ مولانا آزاد کو ایک نامور اور عالمی صحافی بنانے میں دار العلوم ندوۃ العلماء کا ترجمان ”الندوہ“ کا اہم رول رہا ہے، علامہ شبلی سے مولانا آزاد کی ملاقات و رفاقت اور پھر ان کا ”الندوہ“ کے سب ایڈیٹر کے طور پر خدمات انجام دینے کی وجہ سے ان کو غیر معمولی شہرت حاصل ہوئی اور وہ آسمان صحافت پر چمکے۔

بقول ڈاکٹر سلیم الرحمٰن خاں ندوی کہ ”مولانا آزاد کی اسلامی صحافت کا بالفعل آغاز ونشو ونما اس وقت سے ہوتا ہے جب انہوں نے ندوۃ العلماء کے آرگن ”الندوہ“ کی ادارت سنبھالی۔“

مولانا محمد اسحاق جلیس رقم طراز ہیں:

تحریک ندوۃ العلماء کا ترجمان ماہنامہ ”الندوہ“ کا پہلا شمارہ اگست 1904ء مطابق جمادیٰ الاولیٰ ۱۳۲۲ھ منظر عام پر آیا، رسالے کے دو ایڈیٹر تھے؛ مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی اور علامہ شبلی نعمانی۔

اس ماہنامہ میں علوم اسلامیہ کی تجدید، عقل و نقل کی تطبیق، معقول و منقول اور قدیم و جدید کے موازنہ اور عربی نصاب تعلیم پر تحقیقی مضامین شائع ہوتے تھے، اس رسالے نے طبقہ علماء کے جمود میں حرکت پیدا کی، ان کے خیالات میں انقلاب پیدا کیا، انہیں جدید مباحث سے روشناس کرایا، اسلام اور علوم اسلامیہ کی خدمت کے نئے طریقوں، زبان و اسلوب کے انداز اور پیرائے سے متعارف کرایا۔ ”الندوہ“ کا اثر نوجوان علماء اور منتہی طلبہ پر پڑا اور انہوں نے اس کے طرز نگارش، اسلوب بیان کو قبول کیا، چند ہی شماروں کے بعد

''الندوہ'' نے اپنی افادی حیثیت اہل نظر سے منوالی۔

الندوہ نے متعدد ایسے اشخاص کو روشناس کیا جو مستقبل میں علم وفن، ادب وصحافت اور معاشرت وسیاست کے میدان میں ممتاز مقام پر فائز ہوئے ،ان میں اہم شخص مولانا ابوالکلام آزاد ہیں ، اکتوبر 1905ء سے مارچ 1906ء تک مولانا آزاد ''الندوہ'' کے سب ایڈیٹر رہے، اس وقت تک وہ علمی حلقوں میں روشناس نہیں ہوئے تھے، ندوہ میں قیام، مولانا شبلی کی تربیت اور اپنی خداداد ذہانت وصلاحیت کی بدولت وہ برابر ترقی کرتے گئے، الندوہ میں ان کے مضامین نے انہیں پورے ملک میں شہرت بخشی، 1906ء میں وہ ''وکیل'' امرتسر سے وابستہ ہوگئے، 1912ء میں انہوں نے اپنا شہرہ آفاق ہفت روزہ ''الہلال'' نکالا، اتحادِ اسلامی اور سیاسی نظریات میں ان پر مولانا شبلی کے فیض صحبت کا اثر آخر تک نمایاں رہا۔

مولانا ابوالکلام آزادؒ لسان الصدق سے لے کر ہفتہ وار پیغام تک تقریباً 16/اخبارات وجرائد کی ادارت سے وابستہ رہے۔ اس عرصے میں انہوں نے ایک بار بھی اپنی نظریاتی اور فکری اساس سے گریز نہیں کیا۔ ہفتہ وار الہلال مولانا ابوالکلام آزاد کی صحافت کا نقطہ عروج تھا اور انہوں نے اس کے ذریعہ مسلمانوں کے اندر انگریزوں کے خلاف صور پھونکنے کا کام انجام دیا۔ الہلال کی اشاعت 25 ہزار تک پہنچ گئی اور یہ صحافت کا ایک اعلیٰ معیار قرار پایا۔ انگریزوں نے پھر الہلال کی اشاعت پر تیغ زنی کی اور آخر کار 2 سال کی اشاعت کے بعد اس مقبول عام اخبار کی اشاعت بند کرنی پڑی جس کے ازالے کے لیے مولانا آزاد نے البلاغ کا اجرا کیا۔

مولانا آزاد کی صحافتی زندگی کو تین ادوار میں تقسیم کیا جاتا ہے؛ ان ادوار کو مشقی دور، ارتقائی دور اور دور عروج کے نام دیے گئے ہیں۔

مشقی دور کے ضمن میں 1899 سے 1905 تک کو شامل کیا گیا ہے۔ یہ دور ''نیرنگ عالم'' کے اجراء سے ''لسان الصدق'' کی بندش پر ختم ہوتا ہے۔ مولانا آزاد کا پہلا رسالہ ''نیرنگ عالم'' ہے جس کا اجراء 1899 میں ہوا، انہوں نے یہ گلدستہ شاعری کی تکمیل سمجھ کر نکالا تھا، اسی عرصے میں مولانا آزاد کے اندر مضمون نگاری کا ذوق بھی پیدا ہوا جس کی تکمیل کے لیے ''المصباح'' کے نام سے ایک رسالہ جاری کیا لیکن وہ کچھ ہی عرصے جاری رہ کر بند ہوگیا، بعد ازاں 1902 میں مولانا آزاد نے مولانا احمد حسن کے ''احسن الاخبار'' کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

مولانا آزاد کی صحافت کا ارتقائی دور ''الندوہ'' کے نائب مدیر کی حیثیت سے شروع ہوکر ''وکیل'' امرتسر کے دور ثانی پر ختم ہوتا ہے، اس دور میں انہوں نے وقت کے مسائل اور علمی افکار کے بارے میں جو کچھ لکھا وہ پورے اعتماد کے ساتھ لکھا، وہ ''الندوہ'' لکھنؤ سے 1905 کے اواخر میں وابستہ ہوئے اور 1906 کے ابتدائی مہینوں میں اسے چھوڑ کر ''وکیل'' امرتسر چلے گئے، غالباً 1906 کے ابتدائی مہینوں میں انہوں نے خود اپنا اخبار نکالنے کا فیصلہ کیا- 1912 میں ''الہلال'' کا اجراء ان کے اسی خواب کی تعبیر تھی۔

الندوہ سے ''وکیل'' کے دور ثانی تک جو سفر انہوں نے کیا تھا وہ ارتقائی سفر تھا۔ الہلال کے اجراء کے ساتھ مولانا آزاد کی صحافت کا عروج شروع ہوتا ہے- 1912 سے شروع ہوکر الہلال مختصر اور طویل وقفوں کے بعد دسمبر 1927 میں ختم ہوتا ہے، اس دور میں انہوں نے پورے اعتماد کے ساتھ اپنے قلم کی جولانیوں کو بروئے کار لانے کا کام کیا، اس دور میں انہوں نے ادب اور صحافت کو اپنے معاصرین میں سب سے زیادہ متاثر کیا اور اپنی تحریروں سے مسلمانوں کے مذہبی اور سیاسی افکار میں انقلاب برپا کر دیا، مولانا آزاد کی صحافت کا دور عروج البلاغ کی بندش 1916 پر ہوتا ہے جس کے بعد وہ تقریباً 11 سال تک صحافت کی زندگی سے دور قومی اور ملی تحریک کا حصہ بنے رہے تاہم اس دوران قید و بند کے زمانے میں تصنیف وتالیف اور مطالعے میں منہمک رہے۔

احتجاج اور صحیح طریقۂ عمل

سید محمد مکی حسنی ندوی

انسانی تاریخ اس حقیقت کی گواہ ہے کہ جب بھی کسی معاشرہ میں ظلم وناانصافی، استحصال، معاشی بدحالی یا بنیادی حقوق کی پامالی میں اضافہ ہوا، عوام نے مختلف طریقوں سے اپنی آواز بلند کی، کبھی یہ آواز قلم کے ذریعے اٹھی، کبھی عدالتوں کے دروازے کھٹکھٹائے گئے، کبھی عوامی جلسوں اور جلوسوں کا سہارا لیا گیا اور کبھی پرامن احتجاج کے ذریعہ حکمرانوں کو اپنی ذمہ داریوں کا احساس دلانے کی کوشش کی گئی۔ احتجاج درحقیقت معاشرہ کی بے چینی اور عوامی احساسات کا اظہار ہوتا ہے۔ اگر یہ قانون، اخلاق اور نظم وضبط کے دائرے میں رہ کر کیا جائے تو معاشرے میں مثبت تبدیلی کا ذریعہ بن سکتا ہے لیکن اگر احتجاج تشدد، توڑ پھوڑ، نفرت اور انتقام کا رنگ اختیار کرلے تو وہ اصلاح کے بجائے مزید انتشار اور بدامنی کو جنم دیتا ہے۔

دنیا کی تاریخ میں ایسے متعدد احتجاج ہوئے جنہوں نے نہ صرف اپنے ملک بلکہ پوری دنیا کی سیاست اور سماجی ڈھانچے کو متاثر کیا۔ برصغیر کی آزادی کی تحریک میں مہاتما گاندھی نے عدم تشدد اور سول نافرمانی کو احتجاج کا بنیادی ذریعہ بنایا۔ نمک مارچ نے برطانوی حکومت کو یہ احساس دلایا کہ پرامن عوامی مزاحمت بھی ایک مضبوط قوت بن سکتی ہے۔ اسی طرح امریکہ میں سیاہ فام شہریوں کے حقوق کے لیے مارٹن لوتھر کنگ جونیئر کی قیادت میں چلنے والی تحریک نے نسلی امتیاز کے خلاف ایک تاریخی جدوجہد کی جس کا نتیجہ اہم قانونی اصلاحات کی صورت میں سامنے آیا۔ جنوبی افریقہ میں نیلسن منڈیلا کی جدوجہد نے نسل پرستانہ نظام کے خاتمے کی راہ ہموار کی، جب کہ پولینڈ کی سالیڈیریٹی تحریک نے مزدوروں کے حقوق اور جمہوری اصلاحات کے لیے نئی مثال قائم کی۔

اکیسویں صدی میں بھی احتجاجی تحریکوں کا سلسلہ جاری رہا۔ عرب دنیا میں عوامی بیداری کی لہر جسے عرب بہار کہا جاتا ہے، نے کئی ممالک کی سیاسی صورت حال کو بدل دیا۔ اگرچہ بعض ممالک میں اس کے مثبت نتائج سامنے آئے لیکن بعض جگہوں پر خانہ جنگی اور سیاسی عدم استحکام نے یہ بھی ثابت کیا کہ احتجاج کے ساتھ حکمت، قیادت اور مضبوط ارادوں کا ہونا بھی ناگزیر ہے۔

ہندوستان بھی احتجاجی روایات سے مالا مال ملک ہے، آزادی کی تحریک سے لے کر موجودہ دور تک مختلف سماجی، معاشی اور سیاسی مسائل پر عوام نے اپنے جمہوری حق کا استعمال کرتے ہوئے احتجاج کیا ہے۔ کسان تحریک، بدعنوانی کے خلاف تحریک، خواتین کے حقوق کے لیے مظاہرے اور نوجوانوں کی جانب سے روزگار اور امتحانی شفافیت کے مطالبات اسی تسلسل کا حصہ ہیں۔ ہندوستان کا آئین شہریوں کو پرامن طریقے سے اپنی رائے کے اظہار اور اجتماع کا حق دیتا ہے، تاہم اس حق کے ساتھ یہ ذمہ داری بھی وابستہ ہے کہ احتجاج قانون، امن عامہ اور دوسروں کے حقوق کو متاثر نہ کرے۔

حالیہ برسوں میں ہندوستان میں نوجوانوں کی ایک نئی عوامی تحریک (CJP-Cockroach Janta Party) کاکروچ جنتا پارٹی کے نام سے سامنے آئی جس نے اپنے منفرد انداز اور علامتی احتجاج کی وجہ سے عوامی اور ذرائع ابلاغ کی توجہ حاصل کی۔ اس تحریک کا نام بظاہر غیر معمولی معلوم ہوتا ہے مگر اس کے بانیوں کا کہنا ہے کہ انہوں نے ''کاکروچ'' لفظ کو کسی کے طنز کی بنیاد پر اس لیے علامت بنایا کہ یہ سخت سے سخت حالات میں بھی زندہ رہنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ ان کے مطابق آج کا نوجوان بھی بے روزگاری، امتحانی بے ضابطگیوں، مہنگائی اور مختلف معاشی مشکلات کے باوجود جدوجہد کررہا ہے، اسی لیے اس علامت کو اختیار کیا گیا۔

CJP کے احتجاجات کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ روایتی نعروں اور جلسوں کے بجائے علامتی اور تخلیقی انداز اپناتے ہیں تاکہ عوام اور حکومت دونوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرسکیں۔ ان کے حامیوں کا خیال ہے کہ اس منفرد انداز نے نوجوان نسل کو سیاسی اور سماجی مباحث میں دلچسپی لینے کی ترغیب دی، جبکہ ناقدین کے نزدیک

صرف علامتی احتجاج اس وقت تک مؤثر ثابت نہیں ہوسکتا جب تک اس کے ساتھ عملی اور قابل عمل تجاویز بھی پیش نہ کی جائیں۔

دنیا کی تاریخ یہ سبق دیتی ہے کہ احتجاج کی کامیابی صرف عوام کی تعداد سے نہیں بلکہ اس کے مقصد، اخلاق، نظم وضبط اور قیادت سے وابستہ ہوتی ہے۔ وہ احتجاج زیادہ دیرپا اور مؤثر ثابت ہوتے ہیں جو عوامی شعور کو بیدار کریں، مکالمے کا راستہ کھلا رکھیں، تشدد سے گریز کریں اور قانون کے دائرہ میں رہ کر اصلاح کی کوشش کریں۔ اس کے برعکس جو احتجاج نفرت، توڑ پھوڑ، سرکاری یا نجی املاک کی تباہی، یا عام شہریوں کی مشکلات کا سبب بن جائیں، وہ اپنے مقصد کو کمزور کردیتے ہیں اور عوامی حمایت بھی کھو بیٹھتے ہیں۔

دنیا کے کامیاب احتجاجات کا ایک مشترکہ وصف یہ ہے کہ ان میں عوامی شعور کے ساتھ ساتھ اخلاقی قوت بھی موجود تھی۔ جب احتجاج صرف غصے کے اظہار تک محدود نہ رہے بلکہ اس کے ساتھ واضح مطالبات، ذمہ دار قیادت اور عوامی مفاد وابستہ ہو تو اس کے کامیاب ہونے کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔ یہی اصول آج کے ہندوستان پر بھی صادق آتا ہے۔ نوجوانوں کو درپیش بے روزگاری، مہنگائی، امتحانی نظام کی خامیاں، سرکاری بھرتیوں میں تاخیر اور دیگر عوامی مسائل ایسے موضوعات ہیں جن پر سنجیدہ مکالمے اور تعمیری کوششوں کی ضرورت ہے۔ اگر کسی تحریک کا مقصد ان مسائل کی نشان دہی کرنا اور حکومت وعوام کے درمیان رابطے کا ذریعہ بننا ہو تو وہ جمہوری معاشرے میں ایک مثبت کردار ادا کرسکتی ہے۔

ہر احتجاجی تحریک کے ساتھ تنقید بھی وابستہ ہوتی ہے۔ بعض ناقدین کا خیال ہے کہ علامتی اور طنزیہ احتجاج وقتی توجہ تو حاصل کرلیتے ہیں لیکن اگر ان کے ساتھ قابل عمل منصوبے، مضبوط تنظیم اور دیرپا حکمت عملی نہ ہو تو ان کے اثرات محدود رہ جاتے ہیں۔ دوسری طرف حامیوں کا کہنا ہے کہ جب روایتی ذرائع عوامی مسائل کو مؤثر انداز میں اجاگر نہ کرسکیں تو نئے اور منفرد انداز اختیار کرنا وقت کی ضرورت بن جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی بھی تحریک کی کامیابی کا فیصلہ اس کی نیت، عوامی خدمت، تنظیمی صلاحیت اور عملی نتائج کی بنیاد پر ہوتا ہے، نہ کہ صرف اس کے نام یا اندازِ احتجاج پر۔

اسلام کی تعلیمات ظلم کے خلاف آواز بلند کرنے کی حوصلہ افزائی کرتی ہیں لیکن اس کے ساتھ عدل، حکمت، صبر اور اخلاق کی پابندی کو لازمی قرار دیتی ہیں۔ قرآن مجید عدل وانصاف کو قائم کرنے کا حکم دیتا ہے اور ظلم سے روکتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تم میں سے جو شخص کسی برائی کو دیکھے تو اسے اپنے ہاتھ سے روکے، اگر اس کی طاقت نہ ہو تو زبان سے اور اگر اس کی بھی طاقت نہ ہو تو دل میں برا جانے اور یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے۔'' (مسلم)

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ برائی کے خلاف آواز بلند کرنا مطلوب ہے لیکن یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ جو بھی طریقہ اختیار کیا جائے وہ حالات، مصلحت اور شرعی حدود کے مطابق ہو۔

اسلامی نقطہ نظر سے ایسا احتجاج درست نہیں جس میں توڑ پھوڑ، آگ زنی، عوامی یا نجی املاک کو نقصان پہنچانا، بے گناہ افراد کو تکلیف دینا، نفرت انگیزی، جھوٹ یا تشدد شامل ہو۔ اسی طرح سڑکیں بلاوجہ بند کر کے مریضوں، طلبہ، مزدوروں اور عام شہریوں کو مشکلات میں مبتلا کرنا بھی قابل تعریف عمل نہیں۔ اسلام اصلاح کا راستہ اختیار کرنے، خیر خواہی، نصیحت، مشاورت اور حکمت کے ساتھ مسائل کے حل کی تعلیم دیتا ہے۔ اگر احتجاج ناگزیر ہو تو وہ پرامن، مہذب، قانونی اور ذمہ دارانہ ہونا چاہیے تاکہ اس سے معاشرے میں فساد کے بجائے اصلاح پیدا ہو۔

ہندوستان جیسے متنوع اور جمہوری ملک میں اختلافِ رائے ایک فطری امر ہے۔ مختلف سیاسی جماعتیں، سماجی تنظیمیں اور عوامی تحریکیں اپنے اپنے نظریات کے مطابق کام کرتی ہیں۔ کسی بھی تحریک، خواہ وہ کاروچ جنتا پارٹی ہو یا کوئی اور، اس کی کامیابی کا دار ومدار اس بات پر ہے کہ وہ عوامی مسائل کے حقیقی حل پیش کرے، آئین اور قانون کا احترام کرے، اختلاف کو دشمنی میں تبدیل نہ ہونے دے اور معاشرے میں امن واستحکام کو نقصان پہنچائے بغیر اصلاح کی کوشش کرے۔

الحاد کا طوفان - اسباب اور علاج

محمد نجم الدین الرحیمی ندوی

الحادی فکر ونظر اور اس کے رجحانات واستدلال کا تجزیہ اس حقیقت کو نمایاں کرتا ہے کہ عصر نو کے علم بردارانِ الحاد ودہریت جن اسباب وعلل کی وجہ سے مذہب وخدا کا انکار کرتے ہیں، ان میں ایک مذہب والٰہ کا تصور بھی ہے جیسا کہ گزشتہ تحریر میں ذکر کیا گیا اور تصور الٰہ پر اچھی روشنی ڈالی گئی تھی، تصور الٰہ کے نظام فکر ونظر میں اس مسئلہ کی وضاحت میں مسلم علماء وعظیم صوفی فلاسفہ نے دلچسپی کا مظاہرہ کیا ہے، دنیا کے مذہب اور اس کے نظام ہائے فکر وفلسفہ کے برعکس اسلام کا نظام وتصور الٰہ انتہائی شفاف اور اعتقادی واخلاقی اور فکری لحاظ سے اپنی الگ اور غیر مبہم فکر اور فکری وعملی اہمیت کا حامل ہے، اگر چہ کچھ اہل فکر ونظر مسلم صوفی فلاسفہ کے نظری وفلسفیانہ منہج ورجحان نے ایک فکری ونظریاتی نظام کی صورت عطا کردی ہے۔

اس سلسلہ میں امام ابن العربی، امام غزالی اور مجدد الف ثانی کے نام لیے جاسکتے ہیں، ان میں سے ہر ایک اپنے تبحر علمی اور عملی بلندی کے باوجود مظلوم دکھائی دیتے ہیں، کیوں کہ ان کو اور ان کی فلسفیانہ توضیحات کو سمجھا نہیں گیا اور ان کی فکری ونظریاتی تفہیم وتشریح میں افراط وتفریط اور بلکہ دوسرے الفاظ میں کہا جاسکتا ہے کہ بہت زیادہ تعصب سے کام لیا گیا، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ امام غزالی نے احیاء العلوم اور تہافت الفلاسفہ وغیرہ اہم ومعرکہ آرا کتابیں لکھ کر انسانی ذہن ودماغ میں نئے ابھر کر آنے والے فلسفیانہ سوالات اور ان کے مناہج ورجحانات کو سامنے لانے کی کامیاب جہد کی، امام الغزالی نے تہافت الفلاسفہ میں مغرب کے یونانی فکر وفلسفہ کے تار بکھیر دئے اور یونانی فرسودہ ومزعومہ نظریہ وفلسفہ کی پامالی کا صاف اعلان کردیا اور ایک نئے منہاج فکر وتحلیل کی اساس قائم کی، احیاء العلوم میں اسلام کے نظام فکر وعمل کے جملہ پہلو کو وسیع دائرہ میں دیکھ کر ضابطہ بندی فرمائی، انتہائی حیرت کی بات یہ ہے کہ جس نے فلسفہ کی بے بسی دیکھی ہو اور فلاسفہ کی الٰہیاتی فکر ونظر اور آراء کی تردید یہ کہہ کر کی ہو:

"وإنهم يحكمون بظن وتخمين من تحقيق ويقين"

(تہافت الفلاسفہ)

انہوں نے اس میں بتادیا کہ فلاسفہ کے الٰہیاتی علوم اور افکار وآرا صرف اور صرف ظن وتخمین ہیں جن کی اساس تحقیق ویقین پر نہیں ہے لیکن اس کا یہ معنی نہیں کہ امام غزالی کے یہاں عقل وذہن کی اہمیت کا انکار ہے بلکہ یہ بتانا مقصود ہے کہ مابعد الطبعیاتی حقیقتوں کا ادراک عقل وذہن کے لامحدود ہونے کے باوجود ممکن نہیں بلکہ محال ہے۔

عظیم مفکر عالم وصوفی امام ابن العربی ان کے بعد اندلس کی زمین سے اٹھے، انہوں نے علم الکلام کے حل میں تصوف کی راہ سے قدم رکھا اور نظریاتی ومعنوی پس منظر میں ایک ایسا فکری دھارا دیا، حقیقت یہ کہ فہم وادراک کے حوالہ سے ان کا دیا ہوا فکری دھارا اور نظریاتی فلسفہ نے بڑی مشکل کھڑی کردی، امام ابن العربی کی فتوحات مکیہ اور فصوص الحکم نامی کتابوں نے مابعد الطبعیاتی مسائل کے فہم وادراک کو اور مشکل وپیچیدہ بناڈالا اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایک مشکل ترین نظریہ ورجحان سامنے آیا جسے "وحدت الوجود" سے تعبیر کیا جاتا ہے، اس فکری منہج اور فلسفیانہ نظریہ نے مسلم تاریخ ومعاشرہ میں مثبت ومنفی اثرات ڈالے، امام ابن العربی کے وحدۃ الوجودی نظریہ ورجحان میں وجود باری تعالیٰ، صفات واسماء الٰہی، کلیہ عوالم، حقیقت

محمدی، نبوت ورسالت، ولایت عامہ وخاصہ، اعیان ثابتہ وجوہر وعرض اور عالم انسانی تفہیم وشرح کے تانے بانے ہیں جو ایسا نہیں کہ آسانی سے ایک لمحہ میں بکھر جائے، ابن العربی کی جامع مگر مشکل وپیچیدہ نظریاتی ومعنوی مسائل اور فکری دھاروں کی فہم کے لیے علمی تبحر، فکر وفلسفہ اور معرفت وعرفاں کے ادراک کی نہ صرف ضرورت ہے بلکہ اس کے لیے فراست وبصیرتِ قلبی، روحانی حقائق کے ادراکات اور ہدایت بھی ناگزیر ضرورت ہے۔

تصور امام ابن العربی کی فہم وادراک کسی قدر مشکل ضرور ہے، اگر غور کیا جائے تو یہی تصور وفلسفہ صوفی منصور حلاج کے یہاں بھی پایا جاتا ہے، اس کے فکری نظام میں وحدۃ الوجود کا فلسفہ ایسا ہے کہ اہل علم ان کے مقام اور اس فلسفہ سے آگاہ ہیں، اس نظریہ کو بعضوں کی شرح سے تقویت پہنچی، شیخ عبدالرزاق اور شیخ عبدالکریم جیلی کے نام خصوصیت سے لیے جاسکتے ہیں، ابن العربی کا تصور توحید میں ان کا فلسفہ وحدۃ الوجود ایسا نظری احساس اور فکری شعور ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ روح انسانی کو روح عقلی سے تعبیر کرتے ہیں، جسم اور روح کو ایک دوسرے کے بالکل برعکس بتا کر یہ کہا ہے کہ جسم محض ایک عارضی سکونت گاہ ہے جس میں کچھ دیر کے لیے روح رہتی ہے پھر جب وہ اپنے روحانی تجربہ کے نتیجہ میں آگے بڑھتی ہے تو جملہ مخلوقات سے بے خبر ہوجاتی ہے، اس منزل پر آکر اسے ذات باری کے سوا کسی بھی شے کا کوئی شعور واحساس نہیں ہوتا بلکہ ہر چیز میں اسے باری تعالیٰ ہی نظر آتا ہے۔ اس نظریہ کو اس شعر میں دیکھا جاسکتا ہے کہ

جب مہر نمایاں ہوا سب چھپ گئے تارے
تو مجھ کو بھری بزم میں تنہا نظر آیا

اسلامی فکر کے منظر میں یہ ایک اختلافی موضوع بن گیا کہ اس فکری زاویۂ نگاہ اور نظری شعور پر علمائے امت نے شدید تنقید کی ہے، کیوں کہ اگر اس کی گہرائی میں اتر کر دیکھا جائے تو یہ وہ نظری احساس اور فکری زاویہ ہے جس کی سرحدیں کفر تک سے جاملتی ہیں، امام ابن تیمیہ اور مجدد الف ثانی امام احمد سرہندی اس سلسلہ میں نمایاں ہوئے ہیں، امام احمد سرہندی نے تصور توحید کی جو شرح فرمائی اس سے مذہبی شعور واحساس کا ایک اور فلسفہ وجود پذیر ہوا جو نظریۂ وحدۃ الشہود سے متعارف ہوا، انہوں نے بتایا کہ صوفی وسالک کو معرفت وعرفان کے سفر میں ایک ایسی کیفیت حاصل ہوسکتی ہے کہ جس میں ہر چیز میں اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی دکھائی نہیں دیتا، راہ معرفت کے اس مشاہدہ کو شہود سے تعبیر کرتے ہیں، اس کو امام ابن العربی کی طرح وجود کی تعبیر ونظریہ سے گریز کرتے ہیں اور اس فکری نظریہ اور نظری شعور کی تردید بھی کرتے ہیں اور وحدۃ الشہود کی تعبیر ونظریہ سازی کی، مکتوبات میں انہوں نے اس پر کئی مقامات پر کلام فرمایا ہے، اس طرح دو مکتب وجود میں آگئے اور فکری وعملی حیثیت سے عوام میں مقبولیت ہوئی اور ان پیچیدہ فلسفوں اور نظریاتی مکتبوں کو شراح بھی میسر آئے لیکن پھر بھی ایک مذہبی فلسفہ کی تشریح میں ایک طرح کی خلیج حائل سی ہوئی، امام شاہ ولی اللہ دہلوی نے دونوں مکتبوں میں ایک وسیع فکری تناظر میں دیکھنے، پرکھنے اور تطبیق کی کوشش فرمائی ہے، جب کہ دونوں کے نظریہ وفلسفہ ایک دوسرے سے بالکل متغائر ہوں تو دونوں کی فکر میں تطبیق کیسے ممکن ہوسکتی ہے؟ مگر امام شاہ ولی اللہ دہلوی کا حوصلہ ہی ہے کہ انہوں نے اس مشکل معاملہ میں حل کی راہ تلاش کی اور فکری نظام کا ایک مضبوط خاکہ اپنی کتابوں میں پیش بھی کیا اور الخیر الکثیر میں انہوں نے ان تمام مسائل پر گفتگو فرمائی ہے۔

موضوع کے پس منظر میں ناانصافی ہوتی اگر اس موقع پر مذہبی فلسفہ اور اشراقی وکشفی مسلم صوفی فلاسفہ نظریاتی مباحث اور تصور خدا کی تفہیم وتشریح کی ہے لیکن ان تمام توضیحات میں بھی ہمیں ایک نظر ڈالنے سے یہ بات واضح طور پر سامنے آئے گی کہ وجود باری، صفات الٰہی، ماہیت، تخلیق وغیرہ دیگر مسائل پر کلام کرنے میں منابع اور مصادر کے طور پر ہر ایک مسلم مفکر ومتکلم، صوفی ومجتہد کے فکری ونظری پس منظر میں قرآن حکیم، احادیث نبویہ، آثار صحابہ اساس کی حیثیت سے نظر آتے ہیں۔

صحابہ کرامؓ کی محبت وجاں نثاری کے چند نمونے

محمد امین حسنی ندوی

حضور اکرم ﷺ کی تربیت یافتہ یہ جماعت جس نے اپنی زندگیوں کو دین اسلام کی نشر واشاعت کے لیے قربان کردیا، جن کا ایک ایک پل، ایک ایک لمحہ حب نبویؐ سے سرشار رہا۔

صحابہ کرام حضور ﷺ کی تربیت یافتہ وہ جماعت ہے جس نے دنیا ہی میں جنت کی بشارت، خدا کی خوشنودی اور رضامندی حاصل کرلی تھی، ان مبارک حضرات کا تذکرہ قرآن کریم میں جابجا ملتا ہے، کہیں ان کے بارے میں آتا ہے: ﴿رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ﴾ (اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے۔)

کہیں ان کو ﴿وَكُلًّا وَعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنَى﴾ کی خوش خبری سنائی گئی، یہ وہ جماعت ہے جس کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت حاصل ہوئی اور اس صحبت سے اس نے بھرپور فائدہ بھی اٹھایا، جس نے اپنا تن، من، دھن سب اللہ کی رضا کے لیے، اس کے رسول کی محبت کی خاطر اور اس کے دین کی مدد کے لیے لٹادیا تھا، یہ وہ جماعت ہے جس کی توجہ کا مرکز اور محبت کا محور صرف ذات نبی تھی، ان کی زندگیاں رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات کا عکس جمیل تھیں، یہی وہ صفات تھیں جس نے ان کو آسمان کا چمکتا ہوا وہ ستارا بنادیا تھا جس سے ان کے بعد کے لوگ روشنی تو حاصل کرتے ہیں مگر اس تک رسائی پانا ان کے لیے ممکن نہیں، صحبت نبی نے ان کو ایمان کی اس لذت سے آشنا کردیا تھا جو لذت ہزاروں برس کی ریاضت کے بعد بھی حاصل نہیں ہوپاتی، وہ لذت ان کو چند منٹ کی صحبت اور صحبت کے نتیجہ میں محبت سے حاصل ہوگئی تھی، یہی وہ لذت آشنائی تھی جس نے ساحران موسیٰ کو ایسا ایمان نصیب کردیا تھا کہ انہوں نے فرعون کی دھمکی کے جواب میں کہا:

﴿فَاقْضِ مَا أَنتَ قَاضٍ﴾ (تم کو جو فیصلہ کرنا ہو کرو۔)

تمہارا فیصلہ تو اس دنیا ہی کی زندگی تک ہے، ہم اپنے رب پر ایمان لاچکے تاکہ وہ ہماری خطاؤں کو اور تم نے جس جادو پر ہمیں مجبور کیا اس کو معاف کردے اور اللہ ہی بہتر ہے اور باقی رہنے والا ہے۔

صحابہ کرام جس چیز میں سب سے زیادہ نمایاں اور ممتاز تھے وہ ان کی فدائیت اور رسول اللہ ﷺ سے ان کی محبت وعقیدت تھی، یہی وجہ تھی کہ ان کی جاں نثاری کے وہ حیران کن واقعات جو اگر تواتر کے ساتھ سیرت اور تاریخ کی کتابوں میں محفوظ نہ ہوتے تو عقل انسانی ان کو تسلیم کرنے سے انکار کردیتی، ان کی جاں نثاری کو ان کے سخت ترین دشمنوں اور خون کے پیاسوں نے بھی تسلیم کیا ہے، صلح حدیبیہ کے موقع پر عروہ بن مسعود ثقفی جن کو قریش نے اپنا قاصد بنا کر آپ ﷺ کے پاس بھیجا تھا، انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ صحابہ کی حیرت انگیز عقیدت کا جو منظر دیکھا اس نے ان کے دل پر عجب اثر کیا، قریش سے جا کر کہا:

”میں نے قیصر وکسریٰ ونجاشی کے دربار دیکھے ہیں لیکن یہ عقیدت اور وارفتگی کہیں نہیں دیکھی، محمد ﷺ بات کرتے ہیں تو سناٹا چھا جاتا ہے، کوئی شخص ان کی طرف نظر بھر کر دیکھ نہیں سکتا، وہ وضو کرتے ہیں تو جو پانی گرتا ہے اس پر لوگ ٹوٹ پڑتے ہیں، لعاب دھن عقیدت کیش ہاتھوں ہاتھ لیتے ہیں اور چہرے اور جسم پر مل لیتے ہیں۔“

صحابہ کرام کی محبت وجاں نثاری کے چند نمونے ملاحظہ کریں:

حضرت خبیبؓ جب کافروں کی قید میں تھے اور سولی کا پھندا ان کے لیے تیار کیا جاچکا تھا، اس وقت ایک سخت دل نے ان کے جگر کو چھیدا اور پوچھا: کہو، کیا تم یہ پسند کروگے کہ محمد ﷺ پھنس جائیں اور میں چھوٹ جاؤں؟ عاشق رسولؐ نے نہایت جوش سے جواب دیا:

”خدا جانتا ہے، میں تو یہ بھی برداشت نہیں کرپاؤں گا کہ میری

جان بچے اور نبی ﷺ کے پاؤں میں معمولی سا کانٹا بھی چبھے۔''

حضرت زید بن الدثنہ رضی اللہ عنہ کو قتل کے لیے حرم سے باہر لایا گیا، اس وقت قریش کے بہت سے لوگ وہاں جمع تھے، ابوسفیان بھی وہاں موجود تھے، انہوں نے حضرت زیدؓ سے کہا: زیدؓ! قسم دے کر میں تم سے پوچھتا ہوں، کیا تم یہ پسند کرو گے کہ تم آرام سے اپنے گھر میں گھر والوں کے ساتھ ہو اور تمہاری جگہ محمد ﷺ ہوں؟ انہوں نے تڑپ کر جواب دیا: ''مجھے تو یہ بھی گوارہ نہیں کہ میں اپنے گھر میں آرام سے ہوں اور محمد ﷺ کو ایک کانٹا بھی چبھے۔''

ابوسفیانؓ نے اس پر کہا: (میں نے کسی کو کسی سے اتنی محبت کرتے نہیں دیکھا جتنی محبت محمد ﷺ کے ساتھی محمد ﷺ سے کرتے ہیں۔)

غزوۂ احد میں حضرت ابو دجانہؓ نے اپنی پیٹھ کو آپ ﷺ پر جھکا کر ڈھال بنا دیا تھا، تیر ان کی پیٹھ پر لگ رہے تھے اور وہ بے حس وحرکت کھڑے تھے، اسی موقع پر زور شور کا حملہ کافروں کی جانب سے ہوا، آپ ﷺ نے فرمایا: کون ان کو پیچھے ڈھکیلتا ہے اور جنت لیتا ہے؟ سات انصاری کھڑے تھے، ایک ایک آدمی باری باری بڑھتا رہا اور آپ ﷺ یہی فرماتے رہے، ساتوں اسی جگہ کام آ گئے۔

حضرت طلحہؓ نے اپنے ہاتھ سے سپر کا کام لیا اور حضور ﷺ کی جانب آنے والے تیر اپنے ہاتھ پر روکے، یہ ہاتھ ہمیشہ کے لیے شل ہو گیا تھا، حضرت ابوطلحہؓ جو مشہور تیر انداز تھے انہوں نے سپر حضور کے چہرہ پر اوٹ کر لیا تھا کہ آپ ﷺ پر کوئی وار نہ آنے پائے، آپ ﷺ کبھی گردن اٹھا کر دشمنوں کی فوج کی طرف دیکھتے تو یہ عرض کرتے: آپ گردن نہ اٹھائیں، ایسا نہ ہو کہ کوئی تیر آ کر لگ جائے، یہ میرا سینہ سامنے ہے۔

اسی موقع پر ایک دفعہ پھر کافروں کی جانب سے ہجوم ہوا تو حضور ﷺ نے فرمایا: کون مجھ پر جان دیتا ہے؟ زیاد بن سکنؓ پانچ انصاری لے کر اس خدمت کے ادا کرنے کے لیے بڑھے اور ایک ایک نے جاں بازی سے لڑ کر اپنی جانیں فدا کر دیں، زیادؓ کو یہ شرف حاصل ہوا کہ حضور ﷺ نے حکم دیا کہ ان کا لاشہ قریب لاؤ، لوگ اٹھا کر لائے، کچھ کچھ جان باقی تھی، قدموں پر سر رکھ دیا اور اسی حالت میں جان دی۔

ایک خاتون جن کے باپ، بھائی اور شوہر سب اسی معرکہ میں شہید ہو گئے تھے لیکن انہوں نے ان میں سے کسی کے بارے میں کچھ نہ پوچھا، البتہ حضور ﷺ کے بارے میں ہر ایک سے پوچھتی رہیں کہ آپ ﷺ کیسے ہیں؟ سب کی طرف سے یہی جواب ملا: حضور اکرم ﷺ خیریت سے ہیں لیکن ان خاتون نے کہا: جب تک میں اپنی آنکھوں سے آپ ﷺ کو نہ دیکھ لوں گی مجھے چین نہیں آئے گا، ان کی بے قراری دیکھ کر ان کو آپ ﷺ کے پاس لایا گیا، جب انہوں نے اپنی آنکھوں سے آپ ﷺ کو دیکھا تو وہ تاریخی جملہ کہا جس کو تاریخ آج تک نہ بھلا سکی ہے اور نہ کبھی بھلا سکے گی، انہوں نے کہا: (آپ ﷺ کے بعد ہر مصیبت ہلکی ہے اے اللہ کے رسول ﷺ!)

خلیفہ ثانی حضرت عمر بن خطابؓ نے حضور ﷺ سے کہا: اے اللہ کے رسول ﷺ! آپ ﷺ ہم کو ہر چیز سے زیادہ محبوب ہیں سوائے اپنی ذات کے تو نبی کریم ﷺ نے کہا: نہیں! جس کے قبضہ میں میری جان ہے اس وقت تک تمہارا ایمان معتبر نہیں ہو سکتا جب تک کہ میں تم کو تمہاری جان سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں، حضرت عمرؓ نے کہا: بس! خدا کی قسم مجھ کو آپ ﷺ اپنی ذات سے بھی زیادہ محبوب ہیں، نبی کریم ﷺ نے فرمایا: اب ٹھیک ہے اے عمر!

حضرت علیؓ سے پوچھا گیا کہ رسول اللہ ﷺ سے آپ کی محبت کیسی تھی؟ حضرت علیؓ نے کہا: خدا کی قسم! آپ ﷺ ہم کو ہمارے مال و دولت، ماں باپ، بیوی بچوں سے زیادہ محبوب تھے۔

یہ چند واقعات ہیں، ورنہ اس جماعت کا تو ہر فرد حب نبی ﷺ میں اس بلندی پر کھڑا نظر آتا ہے جہاں تک صرف صحابہ کرام ہی کی خصوصیت ہے، حضرت عبداللہ بن مسعود کا ارشاد ہے: آپ ﷺ کے صحابہ اس امت میں سب سے بہترین لوگ ہیں، صاف دل اور علم میں گیرائی رکھنے والے اور تکلف سے دور رہنے والے، یہ وہ لوگ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کی صحبت کے لیے اور دین کو بعد والوں تک منتقل کرنے کے لیے چن لیا تھا، ان کے اخلاق اور ان کے طریقے کو اپناؤ، یہ محمد ﷺ کے ساتھی ہیں اور صحیح راستہ پر ہیں۔

قیام ندوۃ العلماء اور چند اہم شخصیات

ابوالحسن علی حسنی ندوی

تاریخ کے سیاہ صفحات میں ایک ایسا صفحہ ہے جس کو مسلمانان ہند کبھی فراموش نہیں کر سکتے، 1857ء یہ وہ سال ہے جس میں اہل اسلام کو باطل طاقتوں کے ہاتھوں سخت شکست کا سامنا کرنا پڑا، پورے ملک میں ایک مایوسی کی کیفیت پھیلتی جارہی تھی، ایمان ویقین کی کمی، دینی تعلیم کی طرف رجحانات کی قلت، علماء اسلام سے بعد واجنبیت کا احساس، مغربی افکار کی بالادستی بڑھتی اور اسلامی اقدار کی اہمیت اپنا وجود کھوتی ہوئی نظر آرہی تھی۔

ایک طرف تو مغربیت اپنے قدم بڑھاتی اور جماتی جارہی تھی اور دوسری طرف علمائے دین اپنے باہمی نزاع میں اس قدر منہمک تھے کہ ان کو اس بڑھتے ہوئے طوفان کی طرف توجہ کرنے کی بھی فرصت نہیں تھی، مغربیت کا جال پھیلتا جارہا تھا، جدید تعلیم کے اثر ورسوخ سے لوگوں کے ذہنوں میں اسلام اور اس کی وسعت، اس کے معاشرتی نظام، اس کی حقانیت اور تمام مذاہب پر اس کی افضلیت وبرتری کا احساس ماند پڑتا جارہا تھا، ایسے حالات میں دو تحریکیں وجود میں آتی ہیں جن کے افکار ونظریات باوجود یکساں ہدف ومقصود کے سراسر متصادم ومتضاد تھے، ایک مغربی اثرات سے دور، قطعی طور پر تعلیم جدید کے خلاف تیغ براں، قدیم طرز تعلیم وطرز فکر کی مؤید اور علم بردار تھی تو دوسری مغربی تہذیب وتمدن کو مسلمانوں کی فلاح وبہبود کا ضامن سمجھتی تھی، فکر کے اس تنوع کے نتیجے میں اختلافات مزید بڑھتے چلے گئے، ایسے حالات میں ضرورت تھی کہ کوئی ایسی تحریک اٹھے جو اس باہمی اختلافات میں ثالثی کا کردار ادا کرے جو مسلمانوں کے درمیان بھڑکتی آگ کو بجھا کر جدید تعلیم یافتہ طبقے کے دل ودماغ میں دین واہل دین کی عظمت ووقار اور علماء کے حق میں ان کے اعتماد کو بحال کر سکے اور دینی تعلیم یافتہ جماعت کو وسعت فکر وکشادہ قلبی کے ساتھ عصری تعلیم یافتہ لوگوں سے ربط وتعلق مضبوط کرنے پر آمادہ کر سکے اور ایک ایسی جماعت تشکیل دے جو عصری تقاضوں کو سامنے رکھ کر جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے افکار ونظریات، ان کی نفسیات اور ان کے مزاج ومذاق کے مطابق دین کی تفہیم وتشریح کا فریضہ انجام دے سکے۔

ایسے سنگین حالات میں چند اہل فکر ونظر مردان باصفا اس ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے کانپور کے ایک چھوٹے سے مدرسے میں ایک تحریک کا اغاز کرتے ہیں جس کو تحریک ندوۃ العلماء کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

اس تحریک کے متعدد مقاصد میں سے دو بنیادی مقاصد ایسے تھے جس کی ضرورت شدت سے محسوس کی جارہی تھی، ان میں سے ایک کا تعلق علم یعنی تجدید نصاب اور ایک کا تعلق اہل علم یعنی رفع نزاع باہمی سے تھا، آخر الذکر کی پرزور تائید ہوئی اور اس کے عملی نتائج جلد سامنے آئے، ملک بھر میں بھائی چارے کی ایک فضا قائم ہونے لگی، بغض وعداوت کے تاریک جنگلوں میں پھر سے آفتاب اخوت اسلامی اپنی شعاعیں بکھیرنے لگا، تنگ نظری کشادہ دلی میں تبدیل ہوگئی اور علماء ملت نے پورے اتحاد واتفاق کے ساتھ ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو کر مسلمانان ہند کی فلاح وبہبود کے تئیں تبادلہ خیال اور عملی کاروائی کی سعی وکوشش شروع کر دی لیکن اول الذکر کی تکمیل میں رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑا، اہل مدارس تحفظات اور شکوک وشبہات کا شکار ہوئے اور اصلاح نصاب کو ایک قسم کا انحراف تک سمجھنے لگے جس کے نتیجے میں اس اہم مقصد کی تکمیل میں بڑی دشواری پیش آئی اور مسلسل پیش آتی رہی، بالآخر ندوۃ العلماء کو خود اپنا دارالعلوم قائم کرنا پڑا جس میں حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے بقدر حاجت نصاب تعلیم وطریقہ تعلیم میں وقتاً فوقتاً تبدیلی ہوسکے اور جدید چیلنجز سے مقابلہ کے لیے افراد تیار ہوسکیں۔

اللہ کے فضل وکرم سے جلد ہی اس کے بہترین نتائج سامنے آئے اور یہاں سے ایسے نابغہ روزگار اہل علم وفن پیدا ہوئے جنہوں نے ہندوستان ہی نہیں بلکہ پورے عالم اسلام کو ندوۃ العلماء کے پیغام سے روشناس کرایا، اس کی نافعیت کو عام کیا اور اس تحریک کو بلندیوں کے اعلیٰ معیار تک پہنچایا۔اس تحریک کے بانیان پر اگر نظر کی جائے تو تمام کے تمام ہی اس دور کی اہم ترین شخصیات تھیں لیکن خاص طور پر دو حضرات قابل ذکر ہیں:

(۱) مولانا محمد علی مونگیری رحمہ اللہ: آپ ندوۃ العلماء کے ناظم اول تھے اور سالہا سال یہ خدمت انجام دیتے رہے، تاعمر اس تحریک سے وابستہ ہی نہیں بلکہ سرگرم عمل رہے اور اس کے مفاد کو نصب العین بنایا، ملک بھر میں دورے کر کے تحریک ندوۃ العلماء کی افادیت لوگوں کو ذہن نشین کرائی اور ندوہ کے سالانہ جلسوں کے انتظام وانصرام کی ذمہ داری بخوبی انجام دیتے رہے۔

(۲) علامہ شبلی نعمانی رحمہ اللہ: ندوۃ العلماء کی تاریخ کا ایک روشن ترین باب علامہ شبلی نعمانی رحمہ اللہ کی شخصیت بھی ہے، آپ تادم حیات اپنی بالغ نظری اور دین ودنیا کے عمیق مطالعے کی روشنی میں اس تحریک کی بقاء وترقی کے لیے کوشاں و پریشاں رہے، آپ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے معتمد تعلیم بھی رہے اور آپ کے دور معتمدی میں دارالعلوم سے وہ لائق وفائق علماء نکلے جنہیں علم وعمل کی دنیا میں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا، آپ ہی کے زمانہ معتمدی میں دارالعلوم کے سالانہ اجلاس عام میں طلبہ دارالعلوم کی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا گیا جس میں عربی واردو تقاریر اور عربی قصائد وغیرہ پڑھے گئے جس کی وجہ سے ندوۃ العلماء کو مسلمانان ہند کا مزید اعتماد حاصل ہوا اور اس اقدام کے خوش آئند نتائج سامنے آنے کا یقین لوگوں کے دلوں میں مستحکم ہوا۔

آپ کے علمی کارناموں پر نظر ڈالی جائے تو ''سیرۃ النبیؐ'' آپ کی تصنیفی زندگی کا سب سے بڑا مظہر اور سب سے قیمتی سرمایہ ہے مگر افسوس کہ آپ نے اس کا کچھ ہی حصہ قلم بند کیا تھا کہ داعی اجل کو لبیک کہنا پڑا اور آپ کے اس ادھورے کام کو آپ کے لائق وفائق شاگرد علامہ سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ نے مکمل کیا۔

اسی طرح آپ کی ایک اور مایہ ناز کتاب ''الفاروق'' ہے جو اس زمانہ کے بہت سے فتنہ پروروں کے فتنے اور شرانگیزوں کے شر کے نتیجے میں پیدا ہونے والے شکوک وشبہات کا بہترین ازالہ اور سدباب ہے۔

فرزندان ندوہ میں گو سینکڑوں نام آسمان علم وفن پر تاباں ودرخشاں ستاروں کے مانند چمک رہے ہیں لیکن خاص طور سے دو شخصیات قابل ذکر ہیں:

(۱) سید الطائفہ علامہ سید سلیمان ندویؒ: آپ علامہ شبلی نعمانیؒ کے بعد آپ کے جانشین اور دارالعلوم ندوۃ العلماء کے معتمد تعلیم مقرر ہوئے اور پورے نظم ونسق کے ساتھ اس تحریک کو لے کر آگے بڑھتے رہے۔

آپ کو زبان وادب پر مکمل قدرت کے ساتھ ساتھ فکری توازن و اعتدال، دینی بصیرت، دوراندیشی وباریک بینی، سیرت وسوانح کا گہرا مطالعہ واعلیٰ ذوق حاصل تھا، آپ کی حضور اکرم ﷺ کی حیات طیبہ، اس زمانے کے حالات، لوگوں کے طور طریق، ان کی طبیعت ومزاج اور اس وقت کی قوموں کے ادیان و مذاہب، ان میں رائج عادات و رسومات، ان کی نظر میں جزیرۃ العرب کی حیثیت اور اسی طرح حضور اکرم ﷺ کی بعثت سے متعلق تمام پہلوؤں پر مکمل نظر تھی، چنانچہ ''سیرۃ النبیؐ'' جس کی ابتداء آپ کے استاد علامہ شبلی نعمانی نے کی اور آپ کو اس کی تکمیل کی وصیت فرمائی تھی، آپ کی وہ معرکۃ الآراء کتاب ہے جس میں آپ نے سیرت کے بحر زخار میں غوطہ زنی کر کے وہ جواہر پارے برآمد کیے جن پر عام سیرت نگاروں کی نظر بھی نہیں جاتی۔

آپ کی علمی لیاقت کا اندازہ اس سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ 1907ء کے جلسہ عطائے سند میں جو دارالعلوم سے آپ کی فراغت کا سال تھا، آپ نے جلسہ میں شریک لوگوں کی جانب سے منتخب کردہ موضوع ''ہندوستان میں اسلام کی اشاعت کیوں کر ہو؟'' پر ایسی دل نشین وپرمغز تقریر کی کہ ہر طرف سے احسنت وآفرین کی صدائیں بلند ہونے لگیں اور آپ کے استاد علامہ شبلی نعمانی رحمہ اللہ نے جوش مسرت میں اپنا عمامہ آپ کے سر پر رکھ دیا۔

(۲) مفکر اسلام حضرت مولانا ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمہ اللہ:
چمنستان ندوہ کا ایک اور گل سرسبد جس کی خوشبو سے اس گلشن علم وفن کو بلکہ عالم اسلام کو ایک نئی تازگی فراہم ہوئی، اہل عرب وعجم جس کی نکہت سے بہرہ مند ہوئے وہ مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمہ اللہ کی ذات عالی تھی۔

بچپن ہی میں آپ کو مطالعہ کا شوق دامن گیر ہوا اور یہ دلچسپی بڑھتی چلی گئی، کم عمری میں ہی آپ نے سیرت کی کئی کتابوں کا مطالعہ کرلیا جس کے نتیجہ میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت، آپ کی سنتوں کی مکمل طور پر پیروی کرنے، آپ کے لائے ہوئے دین کی تعمیر وترقی کی خاطر اپنے آپ کو کھپا دینے، اسلام کے نظام حیات کو دنیا کے ہر فلسفہ سے افضل وبرتر قرار دینے اور اس کے یقین کو امت مسلمہ کے ذہن ودماغ میں راسخ کرنے کا عزم دل میں شعلہ زن ہوا اور آپ کا یہ جذبہ، اس کی راہ میں آپ کی جد وجہد اور وسیع مطالعہ آپ کی تصنیف ''ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین'' کی شکل میں رونما ہوا، اس کتاب نے عالم اسلام کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا، مغربی افکار کا زور توڑا اور مسلمانوں کی نیم مردہ اسلامی غیرت وحمیت کو جلا بخشی۔

اس کے علاوہ آپ کی کئی کتابیں عربی واردو میں موجود ہیں جن کی تعداد ۵۰۰/ سے متجاوز ہے۔

ندوہ سے آپ کا تعلق فکری وجذباتی ہونے کے ساتھ ساتھ خاندانی بھی تھا، آپ کے والد محترم ندوۃ العلماء کے ناظم رہے اور آپ کے برادر اکبر 30 سال تک عہدۂ نظامت پر فائز رہے اور ان کے بعد متفقہ طور پر آپ ناظم ندوہ منتخب ہوئے۔

یہ بات کہنا کسی قدر مبالغہ نہیں ہوگا کہ ندوۃ العلماء کو جتنی شہرت آپ کے زمانے میں ملی اور جس قدر عرب ممالک میں اس کو مقبولیت حاصل ہوئی وہ کسی اور دور میں نہیں ہوئی جس کا شاہد سن 1975ء میں منعقدہ 85 سالہ وہ تاریخی اجلاس عام تھا کہ جس میں ہندو بیرون ہند کے مشاہیر اہل علم ودانشوران موجود تھے۔

ندوہ کی تاریخ میں ایسی بے شمار شخصیات گزری ہیں کہ جن کے کارناموں کو درج کیا جائے تو دفتر کے دفتر سیاہ ہوجائیں لیکن یہاں صرف ان حضرات کا ذکر ہے جن کو مختلف وجوہات کی بنا پر اپنے اپنے دور میں خاص امتیاز حاصل رہا۔

تحریک ندوہ کی اہمیت وافادیت علامہ اقبال کی نظر میں

حضرت مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی

''ندوۃ العلماء کے ان کارناموں کی روشنی میں جو اس نے تعلیم وثقافت، فکری رہنمائی اور قائدانہ کردار کے میدان میں انجام دیے ہیں اور جس طرح ان فکری گمراہیوں اور الحادی فلسفوں کا مقابلہ کیا جنھوں نے عالم اسلامی اور عالم عربی کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا اور جو مردان کار اس نے باطل تحریکوں اور اسلام دشمن سازشوں کے مقابلے کھڑے کردیئے، ان سب کے پس منظر میں حالات پر نظر رکھنے والے کو ترجمان حقیقت، مفکر اسلام ڈاکٹر محمد اقبال کی فراست، دور بینی اور ذہانت کی داد دینی پڑے گی کہ انھوں نے آج سے پچاس سال پہلے یہ کہا تھا کہ

''میرا ایک مدت سے عقیدہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمان جو سیاسی اعتبار سے دیگر ممالک اسلامیہ کی کوئی مدد نہیں کرسکتے، دماغی اعتبار سے ان کی مدد بہت کرسکتے ہیں، کیا عجب ہے کہ اسلامی ہند کی آئندہ نسلوں کی نگاہوں میں ''ندوہ'' علی گڑھ سے زیادہ کارآمد ثابت ہو۔'' (ندوۃ العلماء ایک دبستان فکر ایک رہنما تعلیمی تحریک: ۲۸)

ہم نے سبق لیا ہے حیاتِ رسولؐ سے

محمد ارمغان بدایونی ندوی

فاران کی چوٹیوں سے جب اسلام کا سورج طلوع ہوا اور آپ ﷺ نے حق کی ندا لگائی تو آپ ﷺ پر اس وقت کا سڑا ہوا سماج جو الزامات لگا سکتا تھا وہ سب لگانے کی آخری حدیں پار کر دی گئیں، جب کہ اس وقت کے اہل عرب کی صدق بیانی اور راست گوئی ضرب المثل تھی مگر پھر بھی دشمنی میں وہ اس حد سے گزر گئے کہ آپ ﷺ کو سب کچھ کہا۔ انھوں نے آپ ﷺ کو جھوٹ گڑھنے والا کہا:

﴿قَالُوا إِنَّمَا أَنتَ مُفْتَرٍ﴾ (النحل: ۱۰۱) (وہ (کافر) کہتے ہیں بے شک تم ہی تو گڑھ گڑھ کر لانے والے ہو۔)

ذرا غور کریں کہ جھوٹی بات گڑھنے والا اسے کہا جا رہا ہے جس کی نبوت سے قبل چالیس سالہ زندگی دروغ گوئی سے پاک ہے اور پورا جزیرۃ العرب اس کی سچائی اور امانت داری کا قائل ہے۔ کیا حق کی صدا لگانے والے محبوب دو عالم ﷺ کا کلیجہ مارے درد والم کے نہ پھٹا ہوگا؟!

انھوں نے آپ ﷺ کو مجنوں یعنی دیوانہ یا پاگل قرار دینے کی بھی مذموم حرکت کی: ﴿إِنْ هُوَ إِلَّا رَجُلٌ بِهِ جِنَّةٌ﴾ (المؤمنون: ۲۵) (یہ تو پاگل سا آدمی معلوم ہوتا ہے۔)

ذرا سوچیں کہ دیوانگی کا الزام اس ذات بابرکت پر لگ رہا ہے جس کی ذات سراپا حکمت و سمجھ داری تھی اور جس کے نفس وجود سے بعض وہ مسائل منٹوں میں حل ہو جاتے تھے جو بسا اوقات بڑے بڑے قابل افراد سے حل نہ ہوتے۔ نعوذ باللہ! اگر اس دعویٰ میں کچھ دم ہوتا تو کیا آپ بعثت سے قبل ایک کامیاب تاجر ثابت ہوتے اور کیا پورے مکہ کی امانتیں آپ کے پاس ہوا کرتیں؟! مگر پھر بھی اس صاف ستھرے ریکارڈ کے باوجود یہ سن کر کس انسان کا جگر حزن وملال سے شق نہ ہوگا؟!

آپ ﷺ کی زباں دانی اور فصاحت و بلاغت نبوت سے پہلے تسلیم شدہ تھی تاہم یہ بھی سب جانتے تھے کہ آپ پڑھنا لکھنا نہیں جانتے ہیں تو پھر اس وقت کیا حال ہوا ہوگا جب آپ ﷺ کی باتوں کو پریشاں خوابیاں بتایا گیا یا شاعری کا الزام لگایا گیا، یہ طعنہ آپ ﷺ کے لیے ہتکِ عزت سے کم نہ تھا؟!

﴿قَالُوا أَضْغَاثُ أَحْلَامٍ بَلِ افْتَرَاهُ بَلْ هُوَ شَاعِرٌ﴾ (الأنبياء: ۵) (وہ بولے یہ تو پریشاں خوابیاں ہیں بلکہ خود انھوں نے گڑھ لیا ہے، نہیں! یہ تو شاعر ہیں۔)

آپ ﷺ کو بخوبی علم تھا کہ آپ ﷺ ہی محبوب رب العالمین اور افضل رسول ہیں تو پھر اس وقت بہ حیثیت بشر کیا عالم ہوا ہوگا جب مدینہ کے چند اوباشوں نے شہر بدری کا نعرۂ بد بلند کیا تھا اور کائنات کی سب سے پاکیزہ ومحترم شخصیت کو نعوذ باللہ ذلیل کہہ کر خود اپنی ذلالت کا حد درجہ ثبوت دیا تھا، قرآن مجید میں ارشاد ہے:

﴿يَقُولُونَ لَئِن رَّجَعْنَا إِلَى الْمَدِينَةِ لَيُخْرِجَنَّ الْأَعَزُّ مِنْهَا الْأَذَلَّ﴾ (وہ کہتے ہیں کہ اگر ہم مدینہ لوٹے تو وہاں جو عزت والا ہے وہ ذلت والے کو نکال باہر کرے گا۔)

آپ خود غور کریں جب انسانیت کے دشمن رحمت دو عالم ﷺ پر کیچڑ اچھالتے اچھالتے تھک گئے اور ان کے ترکش کے تمام تیر تقریباً ختم ہو گئے تو اس وقت انھوں نے محسن انسانیت ﷺ کے حرم کو بھی نہ بخشا اور جو الزام آپ ﷺ پر براہ راست لگانا ناممکن تھا، وہ الزام آپ ﷺ کے حرم پر کسا اور اس طرح اپنے دل کی پیاس بجھانے کی کوشش کی۔ کیا اس بدترین حرکت کا آپ ﷺ پر بہ حیثیت بشر کوئی فرق نہ پڑا ہوگا؟ کیا آپ ﷺ بہ حیثیت انسان کبیدہ خاطر نہ ہوئے ہوں گے؟ کیا آپ ﷺ کے اندر ردعمل کی کوئی کیفیت یا

جذبات پیدا نہیں ہوئے ہوں گے؟ کیا آپ ﷺ نے ایک بھرپور اور طاقتور جواب دینے کی کوشش کے لیے کبھی نہیں سوچا ہوگا؟ کیا آپ ﷺ طاقت میں کم تھے؟ کیا آپ ﷺ کے ساتھ جاں نثار صحابہ کی ایک وفا شعار جماعت نہ تھی؟ آپ تو ایک ایسی قدسی جماعت کے سربراہ تھے جسے آپ ﷺ کے پسینے اور لعاب دہن تک کی توہین گوارا نہ تھی تو پھر یہ کیسے ممکن ہوا کہ نبی ﷺ کے حرم پر الزام لگا اور آپ ﷺ نے ایک اشارہ دے کر ظالموں کا قلع قمع نہ کیا۔

اس کا جواب بجا طور پر یہی ہے کہ بہ حیثیت انسان یقیناً بہت کچھ خیالات آئے ہوں گے اور آپ ﷺ بھی پریشان ہوتے تھے اور یہ کسی محقق کا دعویٰ نہیں بلکہ قرآن ہی کی تصریحات سے صاف اندازہ ہوتا ہے کہ بعض اوقات آپ ﷺ دل مسوس مسوس کر اور کڑھ کڑھ کر رہ جاتے تھے:

﴿وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُن فِي ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُونَ﴾ (النمل: ۷۰) (اور آپ نہ ان پر غم کریں اور نہ ان کی چالوں سے دل کو چھوٹا کریں۔)

بعض مواقع پر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جب پانی سر سے اونچا ہو گیا تو مزید طاقتور انداز میں تسلی دی گئی، فرمایا:

﴿وَلَا تَحْسَبَنَّ اللَّهَ غَافِلًا عَمَّا يَعْمَلُ الظَّالِمُونَ إِنَّمَا يُؤَخِّرُهُمْ لِيَوْمٍ تَشْخَصُ فِيهِ الْأَبْصَارُ﴾ (ابراھیم: ۴۲) (اور ظالم جو کر رہے ہیں اس سے اللہ کو ہرگز غافل مت سمجھنا وہ تو ان کو اس دن تک مہلت دے رہا ہے جس میں ان کی آنکھیں پتھرا جائیں گی۔)

یقیناً یہ آیات اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ رحمت دو عالم ﷺ کا دل کبیدہ خاطر ہوتا تھا، آپ ﷺ کا موں میں رکاوٹیں پڑتے ہوئے آزردہ خاطر ہوتے تھے، ذہنی سکون اور ذاتی راحت متاثر ہوتی تھی مگر یہی تو کمالِ انسانیت ہے کہ تمام جذبات ایک طرف اور تمام انسانی وفطری تقاضے ایک طرف لیکن حکم رب اور اللہ کی اطاعت ایک طرف، آپ غور کریں کہ وہ رحمت دو عالم ﷺ جن کی ادنیٰ تکلیف بھی رب کائنات کو گوارا نہ تھی مگر پھر بھی اس نے اپنے نبی کو ان مراحل سے گزار کر بعد والوں کے لیے یہ نمونہ دے دیا کہ اسی طریقہ کو اختیار کر کے کامیابی حاصل کرنا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے کہیں بھی اوباشوں کا جواب انھی کی زبان میں دینے یا اپنے کسی بھی ردعمل کے اظہار کی بات نہیں کہی بلکہ ہر جگہ حکمت ومصلحت کو پیش نظر رکھا اور مثالوں اور بدیہی حقائق کے ذریعہ یہ بات صاف کی کہ مشکلات انھی کو پیش آتی ہیں جو حق کی خاطر جیتے ہیں اور کانٹیں انھی کو چبھتے ہیں جو خاردار راستوں پر چلتے ہیں۔

﴿أَمْ حَسِبْتُمْ أَن تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَأْتِكُم مَّثَلُ الَّذِينَ خَلَوْا مِن قَبْلِكُم مَّسَّتْهُمُ الْبَأْسَاءُ وَالضَّرَّاءُ وَزُلْزِلُوا حَتَّىٰ يَقُولَ الرَّسُولُ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ مَتَىٰ نَصْرُ اللَّهِ أَلَا إِنَّ نَصْرَ اللَّهِ قَرِيبٌ﴾ (البقرة: ۲۱۴) (کیا تم سمجھتے ہو کہ جنت میں (یوں ہی) داخل ہو جاؤ گے اور تم پر وہ حالات نہیں گزریں گے جو تم سے پہلوں پر گزر چکے، سختی اور تنگی کا ان کو سامنا کرنا پڑا اور ان کو جھنجھوڑا گیا یہاں تک کہ رسول اور ان کے ساتھ ایمان لانے والے کہہ اٹھے کہ آخر اللہ کی مدد کب آئے گی؟ سن لو! یقیناً اللہ کی مدد قریب ہی ہے۔)

قرآن مجید کی آیات اور سیرت کا مطالعہ ہمیں یہ درس دیتا ہے کہ تمام دشمن طاقتوں اور مخالفین کی ہرزہ سرائیوں کا فیصلہ کن جواب پورے جذبہ احتساب کے ساتھ ''صبر'' جیسی عظیم صفت میں مضمر ہے، صبر ایک ایسی چیز ہے جو مخالفین ودشنام طرازوں کو تھکا دیتا ہے، ان کی ہمت اور حوصلے پست کر دیتا ہے، ان کی اہمیت گھٹا دیتا ہے اور انسانی سماج میں رفتہ رفتہ ان کو ذلیل وخوار کرتا چلا جاتا ہے، اس کے برعکس صابر ومؤمن شخص اپنے اس بنیادی وصف کی بنا پر منزل بہ منزل آگے بڑھتا جاتا ہے، یہاں تک کہ سرخ رو ہو جاتا ہے۔

صبر کی تعلیم دیتے ہوئے ارشاد ہے:

﴿وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ إِلَّا بِاللَّهِ﴾ (النحل: ۱۲۷) (اور آپ صبر کیجیے اور اللہ ہی کی مدد سے آپ صبر کر سکیں گے۔)

ملفوظات داعی اسلام

حضرت مولانا سید عبداللہ حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ

ضبط وپیش کش:

محمد عظیم الدین ندوی

آپ ﷺ کی بشریت اور رسالت پر ایمان:

فرمایا: ''قرآن مجید میں اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿هَلْ كُنتُ إِلَّا بَشَراً رَّسُولاً﴾ (الإسراء: ۹۳) (میں کیا ہوں ایک انسان ہوں جسے رسول بنایا گیا ہے۔)

قرآن کی یہ آیت ہمیں صاف پیغام دیتی ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ کو بیک وقت ''بشر'' اور ''رسول'' ماننا دونوں ضروری ہے، کسی ایک چیز کو ماننے کی صورت میں آدمی گمراہ ہوجائے گا۔اس میں شبہ نہیں کہ آپ ﷺ بشر اور رسول تھے، تاہم یہ سمجھنا بھی نہایت ضروری ہے کہ آپ ﷺ کوئی عام بشر یا عام رسول نہیں تھے بلکہ آپ ﷺ خیر البشر اور خیر الرسول تھے۔''

مقام نبوت کا امتیاز:

فرمایا: ''بعض لوگ اولیاء اللہ کو انبیاء کے مقام تک پہنچادیتے ہیں جب کہ نبوت ایک اعلیٰ ترین مقام ہے، مقام نبوت سے مقام ولایت کا کوئی جوڑ نہیں، مقام نبوت تو وہ ہے کہ نبی کی ایک نظر کیمیا اثر سے اونٹوں کے گلہ بان عالم کی گلہ بانی کا فریضہ انجام دینے لگتے ہیں اور صحابہ رضی اللہ عنہم جیسی قدسی جماعت وجود میں آتی ہے جن کے مقابلہ میں اولیاء اللہ کی کوئی حیثیت نہیں، قرآن کریم میں صحابہؓ کے متعلق صاف ارشاد ہے: ﴿رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ﴾ (اللہ ان سے خوش ہوا اور وہ اللہ سے خوش۔)''

مال کی محبت کا مرض:

فرمایا: ''آج کل ہر ایک مال کی محبت کا اسیر ہے اور بری طرح پیسے کے پیچھے بھاگ رہا ہے، گویا اس وقت تمام حقیقتیں ایک حقیقت کے سامنے جھکی ہوئی ہیں اور وہ ایک حقیقت ہے پیسہ، جب کہ سب سے بری بلا پیسے کی یہی محبت ہے، اسی لیے اسلام میں سب سے زیادہ خرچ کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔''

عند اللہ قبولیتِ حج کی ایک علامت:

فرمایا: ''حج جیسی عظیم عبادت کی اللہ کے نزدیک مقبولیت کی ایک کھلی دلیل یہ بھی ہے کہ اس کے بعد آدمی کے اندر پرہیزگاری آجاتی ہے اور اگر نعوذ باللہ سند قبول عطا نہ ہو تو بعض اوقات اس کے بعد صورت حال مزید بگڑ جاتی ہے۔''

صدقہ کسے دیں؟

فرمایا: ''صدقہ کرنے کا اچھا طریقہ یہ ہے کہ کسی ایسے غریب وفقیر آدمی کو تلاش کرکے خاموشی سے دیا جائے جو شرم کے مارے نہیں مانگتا۔''

کلمہ طیبہ کی اہمیت وضرورت:

فرمایا: ''جس طرح بینک میں بغیر اکاؤنٹ کھولے پیسے جمع نہیں کرسکتے، اسی طرح سچے دل سے کلمہ طیبہ کا قائل ہوئے بغیر اسلامی عبادات بھی عنداللہ مقبول نہیں ہوتی ہیں اور انسان کے نیک اعمال کا آخرت میں اس وقت تک کوئی فائدہ نہ ہوگا جب تک کہ وہ حقیقی کلمہ گو نہ ہو۔''

R.N.I. No.
UPURD/2009/28748

Monthly
Payam-e-Arafat
Raebareli

Volume: 18 ✦ July 2026 ✦ Issue: 07

سید احمد شہید اکیڈمی کی پیشکش

Editor: Bilal Abdul Hai Hasani Nadwi
MARKAZUL IMAM ABIL HASAN AL-NADWI
E-Mail: markazulimam@gmail.com - Dare Arafat, Takiya Kalan, Raebareli (U.P.) 229001 - Mobile: 9792646858
Printed & Published by: Mohammad Hasan Nadwi, On Behalf of Markazul Imam Abil Hasan Al-Nadwi.
Printed at S.A. Offset Printers, masjid ke Peeche, Phatak Abdullah Khan, Sabzi Mandi, Station Road, Raebareli (U.P.)